بسم اللہ الرحمن الرحیم

تذکرہ

فقیہ ملت حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین

مفتاحی

سابق مفتی دارالعلوم دیوبند و صدر اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

ولادت:۲۱/شعبان ۱۳۴۴ھ مطابق ۷/مارچ ۱۹۲۶ء

وفات:۔ ۳۱ /مارچ ۲۰۱۱ء مطابق ۲۵/ربیع الاول ۱۴۳۲ھ۔

اختر امام عادل قاسمی

بانی و مہتمم جامعہ ربانی منورواشریف سمستی پور

مفتی ظفیر الدین اکیڈمی جامعہ ربانی منورواشریف

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(یادوں کی خوشبو)

تذکرہ

فقیہ ملت حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحیؒ

سابق مفتی دارالعلوم دیوبند و صدر اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

ولادت:۲۱/ شعبان ۱۳۴۴ھ مطابق ۷/ مارچ ۱۹۲۶ء

وفات:۔ ۳۱ /مارچ ۲۰۱۱ء مطابق ۲۵ /ربیع الاول ۱۴۳۲ھ۔

اختر امام عادل قاسمی

بانی و مہتمم جامعہ ربانی منورواشریف سمستی پور

مفتی ظفیر الدین اکیڈمی جامعہ ربانی منورواشریف بہار الہند

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب: (یادوں کی خوشبو) تذکرہ فقیہ ملت حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحیؒ سابق مفتی دارالعلوم دیوبند

تالیف: اختر امام عادل قاسمی

سن اشاعت: ۱۴۴۲ھ/۲۰۲۱ء

صفحات: 93

قیمت: 80

ناشر: مفتی ظفیر الدین اکیڈمی جامعہ ربانی منورواشریف، پوسٹ سوہما، ضلع سمستی پور بہار

ملنے کے پتے

☆مفتی ظفیر الدین اکیڈمی، جامعہ ربانی منورواشریف، پوسٹ: سوہما، وایا:بتھان، ضلع سمستی پور، بہار، 848207-رابطہ نمبرات:9934082422 - 9473136822ویب سائٹ:

www,jamiarabbani.org email. Jamia.rabbani@gmail.com

☆مکتبہ الامام، سی 212، شاہین باغ، ابوالفضل انکلیو پارٹ ۲، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی 25

مندرجات کتاب

سلسلہ نمبر	مضامین	صفحات
۱	بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری	۷
۲	مفتی صاحب کا نام پہلی بار	۸
۳	قافلہ سوئے دیوبند	۱۰
۴	دارالعلوم دیوبند کا منظر جمیل	۱۰
۵	مفتی صاحب کے آستانہ پر	۱۵
۶	حضرت منورویؒ سے ملاقات کی کہانی مفتی صاحبؒ کی زبانی	۱۵
۷	ایک تاریخی عقدہ۔حضرت منورویؒ کے نقل مکانی کا پس منظر	۱۶
۸	رابطہ منزل بمنزل	۱۷
۹	مفتی صاحب سے باقاعدہ استفادہ کا آغاز	۱۸
۱۰	مفتی صاحب کا حافظہ اور علمی استحضار	۱۹
۱۱	سلف ہر حال میں خلف پر فضیلت رکھتے ہیں	۲۰
۱۲	اختلاف کے حدود	۲۱
۱۳	صبر واستقامت کے پیکر	۲۳
۱۴	مفتی صاحب کی مجلسیں	۲۴
۱۵	حکیم عزیز الرحمن صاحب	۲۵
۱۶	کاتب مولانا فضل الرحمن صاحب (فضلو بھائی)	۲۵
۱۷	حضرت علامہ مولانا محمد حسین بہاریؒ	۲۵
۱۸	جب یہ مجلسیں میری قیام گاہ پر ہونے لگیں	۲۹

سلسلہ نمبر	مضامین	صفحات
۱۹	زندگی کا پہلا سفر نامہ	۳۰
۲۰	مجلس کے چند نووارد احباب	۳۳
۲۱	ان مجلسوں کی اہمیت	۳۴
۲۲	مفتی صاحب عہد سلف کی یادگار تھے	۳۶
۲۳	تاریخی حسیت اور جذبۂ اعتراف کی بلندی	۳۷
۲۴	خاندانی لوگوں کے ساتھ ان کا برتاؤ	۳۸
۲۵	الٰہ آباد حضرت پرتابگڈھیؒ کی بارگاہ میں	۳۹
۲۶	مدرسہ وصیۃ العلوم الٰہ آباد	۴۱
۲۷	مدرسہ دینیہ غازی پور کی آغوش میں	۴۱
۲۶	منورواشریف—پہلی آمد	۴۳
۲۹	قافلہ سالار کی آخری وصیت	۴۵
۳۰	مشاہدات سفر	۴۷
۳۱	لکھنؤ کا سفر	۴۷
۳۲	حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے آستانہ پر	۴۹
۳۳	سفر دہلی برائے فقہی سیمینار	۵۰
۳۴	حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ سے میری پہلی ملاقات	۵۲
۳۵	مفتی صاحبؒ کی اولیات	۵۳
۳۶	مساجد کو ایک نظام اور فلسفہ کے طور پر پیش کیا	۵۴
۳۷	کتب خانہ کو مستقل فن کی حیثیت سے روشناش کیا	۵۴
۳۸	کتب خانۂ دارالعلوم دیوبند کو فنی بنیادوں پر مرتب کیا	۵۵

سلسلہ	مضامین	صفحات
۳۹	ترتیب فتاویٰ کا عظیم الشان کام	۵۶
۴۰	فرق باطلہ کی سرکوبی۔ رجال کار کی تیاری۔ ایک نئی پیش رفت	۵۸
۴۱	مجموعۂ قوانین اسلام (مسلم پرسنل لاء) کا مسودہ تیار کیا	۵۸
۴۲	دارورسن سے پنجہ آزمائی	۵۹
۴۳	مختلف رنگوں کا بے نظیر امتزاج	۶۰
۴۴	ایک یادگار دستاویزی مضمون	۶۱
۴۵	عکس ٹائیٹل کتابچہ "حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی	۶۳
۴۶	**کمالات وامتیازات (تعمیر شخصیت کے شاندار نمونے**	۶۴
۴۷	ولادت اور تعلیم وتربیت	۶۵
۴۸	خوب سے خوب تر کی جستجو	۶۶
۴۹	بزرگوں سے تعلق	۶۹
۵۰	اکابر سے استفادہ	۷۰
۵۱	بزرگوں کا ماضی دیکھنا چاہئے	۷۵
۵۲	مفتی صاحب پر اکابر کا اعتماد	۷۶
۵۳	مفتی صاحب کے اہم علمی کارنامے	۸۳
۵۴	ایک شفیق مربی	۸۶
۵۵	صاحب دل فقیہ	۸۸
۵۶		
۵۷		
۵۸		

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

حضرت الاستاذ مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحیؒ سابق مفتی دارالعلوم دیوبند عصر حاضر کے انتہائی ممتاز اور قد آور فقیہ تھے جن کی نگاہ بلند ،فکر رسا ،مطالعہ وسیع ،مشاہدہ و تجربہ بے پایاں ،علم پختہ ،دل ودماغ حاضر ،ذہن رواں ، قلم سیال ،زبان شستہ وشگفتہ ،اسلوب تحریر سادہ وسلیس اوراندازبیان علم ومعنیٰ سے لبریز ہونے کے باوجود اس قدر عام فہم کہ اس پر سہل ممتنع ہونے کا گمان ہوتا تھا، دقیق سے دقیق علمی مسئلہ ان کی زبان پر پانی پانی ،خشک سے خشک موضوع بحث ان کی حسن تحریر سے دلچسپ بن جاتا ،علم ومعنیٰ کی ہر رہگذر ان کی نقش پا سے آشنا، فکر وفن کی ہر وادی ان کے حصار نظر میں ،ان کی زندگی وقت کی گردشوں کی آئینہ دار، لباس اور بود وباش ایک عام مؤمن جیسا جس میں نہ کوئی تکلف نہ تصنع ،خالص سلف صالحین کی یادگار، محبت واخلاق عالیہ کا نمونہ ،ان کا آستانہ ہر خاص وعام کے لئے کھلا ہوا، مجلس میں بیٹھ جایئے تو اٹھنے کا جی نہ کرے ،تاریخ کے نہ معلوم کتنے ہی انقلابات ان کے سینے میں دفن، حقائق سے پردہ اٹھاتے تو ان کی زندگی کا ہر باب "قصۂ ہزار داستاں "معلوم ہوتا، حوصلہ شکن بے شمار حالات کے باوجود ان کا عزم پوری طرح جوان ،لمحہ بہ لمحہ بدلتے حالات میں بھی امیدوں کے چراغ روشن ،۔۔۔۔۔میدان خطابت کے شہسوار، توزبان وقلم کے یکتائے روزگار ،فقہ وفتاویٰ میں استاذ الاساتذہ ،اصول وکلیات میں فرید العصر ،ہزاروں جزئیات ان کے خزانۂ دماغ میں محفوظ اور کتابوں کے صفحات ان کی انگلیوں پر مچلتے ہوئے ،فقہی مسائل میں قدیم وجدید

ان کے لئے یکساں، ہر موضوع پر ان کا اشہب قلم بے تکلف رواں دواں،۔۔۔۔۔۔۔ بے شمار اصحاب کمال اور مشائخ عصر کا رنگ اپنی شخصیت میں سموئے ہوئے، ان کی زندگی ایک عہد بھی ایک انجمن بھی، شاعر کا دیوان بھی اور تاریخ کی کھلی کتاب بھی،۔۔۔۔ غرض کمالات کا ایسا تنوع اور فکر وفن کی ایسی جامعیت کہ شاید اس عہد کے ہندوستان میں ان کی مثال ڈھونڈھنے سے نہ ملے،، بظاہر ایک چھوٹا سا نحیف ونزار وجود لیکن ایک پورا عالم اس میں سمایا ہوا،۔۔۔۔۔۔ شخصیت کا وہ کمال کہ ہر مقام کے لئے پوری طرح موزوں ،فکر وفن کی انجمن ہو، علم وادب کی محفل ہو، نظم وانتظام کا موقعہ ہو، تحقیق وتالیف کا ادارہ ہو، تسوید قانون کا مسئلہ ہو، مفتی صاحب ہر میدان کے فرد فرید تھے، نہ کبھی اپنے بزرگوں کو مایوس کیا اور نہ اپنے خردوں کے لئے تشنگی چھوڑی، بہت سے ایسے محاذوں کو انہوں نے تنہا سر کیا جہاں ایک پورے ادارہ کو کام کرنے کی ضرورت تھی۔۔۔۔ اپنے بزرگوں کے بے انتہا معتمد اور اپنے چھوٹوں کے لئے شاندار نمونہ۔۔۔۔۔۔۔۔ مفتی صاحب کے یہاں کام کی بہت اہمیت تھی، کوئی لمحہ ان کا ضائع نہیں ہوتا تھا، وہ لمحہ لمحہ کا حساب رکھتے تھے، اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کے پاس کچھ دن رہنے والے لوگ بھی کام کے بن جاتے تھے۔

مفتی صاحب کا نام پہلی بار

مفتی صاحب بہار کے سر کردہ علماء میں تھے، امارت شرعیہ کے رکن رکین ،حضرت امیر شریعت رابع مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کے انتہائی معتمد، امارت شرعیہ پٹنہ اور جامعہ رحمانی مونگیر کے تقریباً ہر پروگرام کی زینت، ان کے بڑے بھائی اور استاذ امیر

شریعت خامس حضرت مولانا عبدالرحمن صاحبؒ میرے جد اکبر حضرت مولانا عبدالشکور آہؔ مظفر پوریؒ کے تلمیذ رشید، وہ خود میرے جد امجد قطب الہند حضرت مولانا الحاج حکیم احمد حسن منوریؒ کے انتہائی عقیدت مند، عرصہ تک وہ سانحہ مونگیر میں رہے ، بہار میں ان کے شاگردوں کی بھی بڑی تعداد تھی، لیکن مجھے یاد نہیں کہ میرے گھر میں کبھی ان کا ذکر آیا ہو، ان کا اسم گرامی پہلی بار اس وقت سامعہ نواز ہوا، جب میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ کے لئے رخت سفر باندھ رہا تھا، میرے والد بزرگوار حضرت مولانا سید محفوظ الرحمن صاحب دامت برکاتہم اپنے حجرہ سے دو کتابیں نکال کر لائے ، جن کی جلدیں بوسیدہ اوراوراق پارینہ ہو چکے تھے ،(1)اسلام کا نظام امن (2) اور اسلامی حکومت کے نقش و نگار، ان پر مصنف کی جگہ حضرت مفتی صاحب کا اسم گرامی چھپا ہوا تھا ،اور بین القوسین میں 'مرتب فتاویٰ دارالعلوم دیوبند' تحریر تھا اور یہ دونوں کتابیں مصنف کی طرف سے میرے جد امجد حضرت مولانا الحاج حکیم احمد حسن منوریؒ کو ہدیہ میں بھیجی گئی تھیں ، سرورق پر مصنف کے دستخط کے ساتھ جد امجد کا نام بھی مرقوم تھا ،والد صاحب مفتی صاحب سے زیادہ واقف نہیں تھے ،انہی دو کتابوں کے حوالے سے صرف اتنا جانتے تھے کہ دیوبند میں دربھنگہ کے کوئی عالم دین ہیں، جو اپنی قلمی خدمات کی بناپر متعارف ہیں،۔۔۔۔ قبل بھی گاؤں کے کچھ پرانے فضلاء کے ذریعہ انہی کتابوں کے حوالہ سے والد صاحب نے مفتی صاحب کے احوال معلوم کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن خاطر خواہ کامیابی نہیں مل سکی تھی،۔۔۔۔اب جب میرے دیوبند جانے کی باری تھی تو والد صاحب نے یہ کتابیں ہمارے سامنے رکھیں اور فرمایا کہ دیوبند پہونچ کر ان سے ملاقات کرنا، یہ تمہارے دادا کے عقیدت مندوں میں ہیں، ان سے تمہیں دیوبند میں مدد

بھی حاصل ہو گی ان شاء اللہ۔

قافلہ سوئے دیوبند

غالباً ۴/ شوال المکرم ۱۴۰۵ھ م ۲۳/ جون ۱۹۸۵ء کی تاریخ ہو گی کہ ہم تین ساتھیوں کا قافلہ (یعنی میرے علاوہ مولانا عبد الجبار قاسمی موضع سکھاسن ضلع سمستی پور مقیم حال احمد آباد، اور مولانا عبد الرشید قاسمی مقام بردونی ضلع سمستی پور مقیم حال در بھنگہ)غازی پور کے لئے روانہ ہوا، مادر علمی مدرسہ دینیہ غازی پور پہونچ کر ذمہ داران اور اساتذۂ کرام سے ملاقاتیں کیں، ان سے دعائیں لیں، تعلیمی تصدیقنامہ حاصل کیا، دیگر رفقاء درس بھی یہیں شامل ہوئے، پھر ہمارا سات رکنی قافلہ دیوبند کی جانب روانہ ہوا، دو دن کے پر مشقت سفر کے بعد ہم عین صبح کے وقت اذان فجر سے کچھ قبل دارالعلوم دیوبند کے مدنی گیٹ کے سامنے وارد ہوئے، اس زمانہ میں بعض حالات کی بنا پر دارالعلوم کا صدر دروازہ (باب قاسم) رات میں بند رہتا تھا اور اذان فجر کے بعد کھلتا تھا، باب مدنی کا چھوٹا گیٹ کھلا ہوا تھا، یہ دارالعلوم کے احاطۂ دار جدید کا شمالی دروازہ تھا۔

دارالعلوم دیوبند کا منظر جمیل

ہم نے جھانک کر دیکھا تو سرخ عمارتوں کے وسیع و عریض احاطہ کو دیکھ کر کسی عظیم الشان قلعہ کا گمان ہوا، خوشنما بیل بوٹوں، سرو قد اونچے درختوں اور گلزاروں سے سجا ہوا چمنستان، درمیان میں ایک پختہ مستطیل سڑک باب مدنی کو باب معراج سے ملاتی ہے، ٹھیک وسط میں ایک خوبصورت فوارہ ہے، جو دن کے اکثر اوقات جاری رہتا ہے ، جس سے پورا ماحول خوشگوار اور پوری فضا خوش منظر معلوم ہوتی ہے، سیر و تفریح اور

صحت کے لئے انتہائی حسین اور دلکش ماحول ،اسی فوارہ سے ایک راستہ مغرب میں باب الظاہر کی طرف جاتا ہے اور دوسرا مشرق میں دارالعلوم کی برجوں والی بلند وبالا سہ منزلہ پرشکوہ عمارت کی طرف نکلتا ہے جس کے نچلے حصہ میں دارالعلوم کا وسیع وعریض دارالحدیث ہے جہاں قریب ایک ہزار (۱۰۰۰)طلبہ کے بیٹھنے کی گنجائش ہے ،درمیانی منزل پر دارالحدیث فوقانی ہے جو اس وقت ہفتم عربی کی درسگاہ کے لئے استعمال ہوتی تھی ،اور تیسری منزل پر دارالتفسیر کا ایک بڑا ہال ہے ،اور اس کے اوپر وہ بلند گنبد ہے جو آج تک دارالعلوم کا طرۂ امتیاز ہے ،پہلے دیوبند میں اونچی عمارتیں نہیں تھیں تو دور سے یہ گنبد عالی نظر آتا تھا،ٹرینوں اور شاہراہ عام سے گذرنے والے لوگ بھی دور سے ہی اس گنبد کا نظارہ کرتے تھے اور دارالعلوم کے قرب کا احساس ان کے مشام جان کو معطر کرتا تھا، دارالحدیث تحتانی کے مشرقی حصے میں نودرہ کی وہ تاریخی عمارت ہے جس کی بنیاد (اکابر کے مکاشفات کے مطابق)خود ساقی کوثر ،سید الکونین، امام الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ نے الہامی طور پر رکھی ،اور پھر حضور پاک ﷺ کی نو(۹) ازواج مطہرات کی مناسبت سے اکابر دارالعلوم نے نو(۹) درسگاہوں کی تعمیر کی ،تاکہ درجۂ فارسی سے فضیلت تک نو درجات کی پوری تعلیم اسی ایک چھت کے زیر سایہ ہو جائے۔

خود ساقی کوثر نے رکھی میخانہ کی بنیاد یہاں
تاریخ مرتب کرتی ہے دیوانوں کی روداد یہاں [1]

اسی نودرہ سے متصل احاطہ مولسری ہے جس میں مولسری کے دو انتہائی گھنے

---

[1] ۔ ترانۂ دارالعلوم کا ایک شعر

اور سایہ دار درخت تاریخ دیوبند کے نہ معلوم کتنے ہی واقعات کے امین اور چشم دید گواہ ہیں ،اسی احاطہ میں جنازہ کی نماز ادا کی جاتی ہے ،اور اس میں ایک مخصوص مقام ہے جو بزرگوں کے مشاہدات کی روشنی میں کافی بابرکت تصور کیا جاتا ہے ،اسی احاطہ میں ایک میٹھے پانی کا کنواں بھی ہے ،جس کے ساتھ بھی کچھ تاریخی واقعات وابستہ ہیں ،احاطۂ مولسری کے مشرقی حصے میں ایک بلند وبالا اور وسیع وعریض دروازہ پر دارالعلوم کا دفتر اہتمام ہے ،پھر اوپر اس کے جنوب اور مشرق میں دارالعلوم کے دیگر دفاتر پھیلے ہوئے ہیں ،اس دروازہ سے باہر نکلئے تو ایک مختصر احاطہ کے بعد دارالعلوم کا صدر دروازہ باب قاسم ہے ،اسی دروازہ سے متصل دارالعلوم کی مسجد ہے ،اس وقت تک جامع رشید کی تعمیر نہیں ہوئی تھی اور دارالعلوم کی باقاعدہ دو ہی مسجدیں سمجھی جاتی تھیں ،مسجد چھتہ اور مسجد دارالعلوم ،مسجد چھتہ سب سے پرانی بلکہ دارالعلوم کا نقطۂ آغاز ہے ،اسی مسجد میں مہتمم اول حضرت حاجی عابد حسینؒ کا حجرہ تھا ،یہیں پر حاجی صاحب نے حجۃ الاسلام حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم کی تحریک پر مدرسۂ دیوبند کے لئے پہلا چندہ اکٹھا کیا ،پھر حضرت نانوتویؒ نے اپنے تلامذہ میں سے ایک انتہائی جید استاذ ملا محمودؒ کو وہاں تدریس کے لئے مقرر فرمایا ،اور یہیں چھتہ مسجد میں انار کے درخت کے نیچے صرف ایک طالب علم "محمود حسن" (یعنی حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ) کے ذریعہ تعلیم کا آغاز ہوا ،بعد میں حضرت نانوتویؒ بھی اسی مسجد کے ایک حجرہ میں فروکش ہوئے ،۔۔۔ ۔۔دارالعلوم کے دفتر محاسبی میں دارالعلوم کا پورا ریکارڈ موجود ہے ،اسی کے محافظ خانے میں ایک شیشے کے صندوق میں وہ متبرک رومال محفوظ ہے جو عرصہ تک نبی کریم ﷺ کے کپڑے کے ساتھ مس رہا ہے ،۔۔۔۔۔مسجد دارالعلوم کے سامنے سڑک کے اس پار

دارالعلوم کا خوبصورت تین منزلہ مہمان خانہ ہے جو زائرین دارالعلوم کے لئے رات کے گیارہ بجے تک کھلا رہتا ہے، بہت نفیس، صاف ستھرا اور آرام دہ ہے، جہاں مہمانوں کو بہتر قیام کے ساتھ اعلیٰ قسم کی ضیافت بھی فراہم کی جاتی ہے، باب قاسم میں داخل ہوتے ہی بائیں طرف مڑیں تو دارالعلوم کی وسیع وعریض تاریخی لائبریری تھی، جس میں مختلف علوم وفنون پر لاکھوں کتابیں موجود ہیں، اب باب الظاہر کے پیچھے ایک شاہکار عمارت میں یہ لائبریری منتقل ہو چکی ہے، جس نے اپنی وسعت وحسن اور جدت طرازی میں برصغیر کی تمام لائبریریوں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے، لائبریری کے نیچے دارالعلوم کے پندرہ روزہ اخبار "آئینۂ دارالعلوم" کا دفتر تھا (جواب بند ہو چکا ہے)، اس سے تھوڑا آگے جائیں تو احاطۂ مطبخ شروع ہو جاتا ہے، جہاں دارالعلوم میں مقیم ہزاروں افراد کے لئے کھانا تیار کیا جاتا ہے۔۔۔۔۔۔ احاطۂ مطبخ سے مغرب کی طرف نکلیں تو باب معراج سے متصل طلبہ کی اقامتی دو منزلہ خوبصورت عمارت "رواق خالد" ہے۔۔۔۔۔ رواق خالد والے گیٹ سے باہر نکلیں تو دارالعلوم کا لمبا چوڑا مذبح ہے، جہاں جانوروں کے ذبیحہ کا عمل ہوتا ہے، وہاں سے مشرق کی طرف مڑیں، تو دو منزلہ "افریقی منزل قدیم" کی عمارت نظر آتی ہے، یہ بھی طلبہ کا دارالاقامہ ہے، بعض اساتذہ بھی یہاں مقیم ہیں۔۔۔۔۔۔۔ اس کے پاس والی سڑک مغرب میں عید گاہ کی طرف اور مشرق میں شہر کی جانب جاتی ہے، یہیں سے ایک چھوٹا راستہ مسجد چھتہ کے سامنے سے ہوتے ہوئے باب قاسم اور مسجد دارالعلوم کی طرف چلا جاتا ہے، اور دیوبند کی ایک مرکزی سڑک سے مل جاتا ہے، وہ سڑک بھی مشرق میں آبادی کی طرف اور مغرب میں دارالعلوم کے مدرسۂ ثانویہ کے احاطہ کی طرف جاتی ہے، مدرسۂ ثانویہ موجودہ جامع رشید کے بالکل سامنے ہے اور کافی وسیع

وعریض خطہ ہے، اسی میں دارالعلوم کی مشہور زمانہ طبیہ کالج کی عمارت تھی جس کو بعد میں مدرسہ ثانویہ سے بدل دیا گیاہے، یہیں افریقی منزل جدید، اعظمی منزل، دارالتربیت اور دارالاساتذہ کی جدید ترین عمارتیں ہیں، جو انتہائی سلیقہ اور حسن ترتیب کے ساتھ اور جدید فن تعمیر کے مطابق بنائی گئی ہیں، درمیان سے ایک پختہ مستطیل سڑک خم کھاتی ہوئی گذرتی ہے جو باب رشید تک پہونچتی ہے، باب رشید دیوبند کی شاہراہ عام جی ٹی روڈ کی طرف سے دارالعلوم میں داخل ہونے کا دروازہ ہے،۔۔۔۔ مدرسۂ ثانویہ کے احاطہ کے باہر جانب غرب میں مزار قاسمی ہے، جس میں بانئ دارالعلوم حجۃ الاسلام حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے مزار کے علاوہ بہت سے اکابر دیوبند کی قبریں ہیں، مزار قاسمی سے جنوب کی طرف بڑھیں تو تھوڑے فاصلے پر حضرت حاجی عابد حسین صاحب دیوبندیؒ کی قبر ہے، اکثر قبروں پر کتبے لگے ہوئے ہیں، حضرت نانوتویؒ کے والد ماجد حضرت شیخ اسد علی صاحبؒ کی قبر مدنی گیٹ کے سامنے سڑک کے قریب واقع ہے، اب وہ جامع رشید کے احاطے میں آگئی ہے، اور محفوظ ہے ۔۔۔ مدنی گیٹ سے باہر نکلیں تو دائیں طرف خانقاہ محلہ نظر آتا ہے، اب جامع رشید کی عظیم الشان عمارت نے اسے ڈھانپ لیاہے، اسی خانقاہ محلہ میں خاتم المحدثین حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ کا رہائشی مکان تھا جو اب ان کے اہل وعیال کے تصرف میں ہے، خانقاہ محلہ کو عبور کرنے کے بعد دیوبند کی عید گاہ آتی ہے، اس عید گاہ سے تھوڑے فاصلہ پر حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ کا مزار ہے، میرے وقت میں وہ علاقہ بالکل ویران تھا، لیکن اب شہر کے کئی اہم اداروں کی دیدہ زیب اور عالیشان عمارتیں ادھر بن گئی ہیں، مثلاً دارالعلوم وقف، معہد الامام انور وغیرہ، "شہر طیب" بھی اسی خطے میں آباد ہے، بہت سے تجارتی مکتبے، دکانیں

اور پریس بھی قائم ہو چکے ہیں، اب تو وہ پورا علاقہ مستقل شہر نظر آتا ہے۔

بہر حال ہم تھوڑی دیر مدنی گیٹ کے باہر کھڑے ہو کر سوچتے رہے کہ اب کدھر جائیں؟ لیکن پھر ایک شناسا طالب علم کی مدد سے داخلے کی ساری کاروائی مکمل کی گئی ،اور پھر ہم لوگ اس طرح مصروف ہوئے کہ حضرت مفتی صاحبؒ سے ملنے کا خیال ہی نہیں رہا، امتحان داخلہ کا نتیجہ شاندار آیا، مجھے کل ۵۰ نمبرات میں سے ۴۶ اوسط حاصل ہوئے تھے، اس طرح دارالعلوم کی طرف سے تمام ضروری سہولیات مجھے حاصل ہوئیں ،فالحمد للہ علی ذلک۔

مفتی صاحب کے آستانہ پر

تمام اہم امور سے فراغت کے بعد ایک دن بعد نماز مغرب میں مفتی صاحب کے حجرہ کی طرف چلا، قریب پہونچا تو مفتی صاحب اپنے حجرہ کے باہری حصہ میں تشریف فرما تھے، اور کئی طلبہ بھی وہاں موجود تھے، اپنا تعارف کرایا تو مفتی صاحب کا چہرہ کھل اٹھا، فرمانے لگے، اتنی دیر کے بعد ملنے آئے؟۔۔۔ مفتی صاحب نے پہلی ملاقات پر ہی میرے خاندان کے تعلق سے ایک سوال پیش فرمادیا جو برسوں سے ان کے ذہن ودماغ کے اندر تاریخی الجھن کی صورت میں پل رہا تھا:

حضرت منوریؒ سے ملاقات کی کہانی مفتی صاحبؒ کی زبانی

مفتی صاحب نے فرمایا: میری ملاقات تمہارے جد امجدؒ سے ٹرین میں ہوئی تھی، جامعہ رحمانی مونگیر میں ایک ملک گیر کانفرنس ہو رہی تھی، ہم لوگ دربھنگہ سے کھگڑیا کے لئے ٹرین پر سوار ہوئے، دربھنگہ کے ممتاز علماء و قائدین ہمارے قافلے میں

شامل تھے ،مثلاً حضرت مولانا محمود صاحبؒ(نستہ) تلمیذ رشید حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ،اور مولانا تسلیم الدین صاحبؒ (سدھولی)وغیرہ ،اچانک میں نے دیکھا ایک نورانی صورت بزرگ سیدھے سادھے لباس میں ہاتھ میں ایک تھیلا لئے ہوئے ہمارے ہی ڈبے میں داخل ہوئے ،ان کے آتے ہی لوگ سمٹنے لگے ،ہمارے قافلہ کے اکثر لوگوں نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا،سب کے دل ونگاہ ان کی عقیدت واحترام میں جھک گئے،میں نے مولانا محمود صاحبؒ سے دریافت کیا ۔۔۔تو انہوں نے آہستہ سے مجھے فرمایا کہ "یہ سلسلۂ نقشبندیہ کے انتہائی بلند پایہ صاحب نسبت اور صاحب کشف بزرگ ہیں،حضرت مولانا بشارت کریم گڑھولویؒ سے تعلق ہے اور حضرت مولانا عبدالشکور آہؔ مظفرپوریؒ کے بڑے صاحبزادے ہیں "۔۔۔۔۔حضرت مولانا عبدالشکورؒ آہؔ تو میرے استاذ الاستاذ تھے اور طالب علمی کے زمانہ میں مجھے ان کی زیارت ہو چکی تھی،مجھے ان سے بے پناہ انس پیدا ہوا،میں نے آگے بڑھ کر مصافحہ کیا،اپنا تعارف کرایا،تو وہ بھی بہت مسرور ہوئے،بعد میں میں نے اپنی دو کتابیں(جن کا تذکرہ پہلے آچکا ہے)ان کی خدمت میں بطور تحفہ ارسال کیں،سمستی پور کے بعد حسن پور روڈ اسٹیشن آیا تو وہ اتر گئے،معلوم ہوا کہ یہیں قریب میں منوروا ان کا گاؤں ہے۔۔۔

ایک تاریخی عقدہ۔حضرت منورویؒ کے نقل مکانی کا پس منظر

اس وقت سے آج تک یہ عقدہ حل نہ ہو سکا کہ حضرت مولانا عبدالشکور آہؔ مظفرپوریؒ کے صاحبزادہ کا وطن حسن پور روڈ کے قرب ونواح میں کس طرح ہے ؟ پھر ان کے نام کے ساتھ در بھنگوی لگتا ہے جب کہ مولانا عبدالشکور صاحبؒ مظفرپوری تھے

۔۔۔۔۔میں نے اس کی وضاحت کی کہ حضرت مولانا عبدالشکور صاحبؒ کی دو بیویاں تھیں، پہلے محل سے میرے جد امجد تھے، پہلی اہلیہ بی بی حلیمہ خاتون حضرت مظفر پوریؒ کے اپنے ماموں حضرت مولانا امیر الحسن قادریؒ کی صاحبزادی ہیں، حضرت مولانا امیر الحسن قادریؒ پر قدرے جذب کا غلبہ تھا، انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ غیبی اشارات کے تحت بہار کے مختلف ایسے علاقوں میں گذارا جہاں دینی تعلیم کی بے پناہ کمی تھی اور لوگ رسم ورواج کی مختلف بندشوں میں جکڑے ہوئے تھے ،وہ حضرت مولانا سید محمد اسحاق حسینی بانسویؒ کے مرید وخلیفہ تھے ،اسی ضمن میں انہوں نے تقریباً بارہ (۱۲)سال صلحا بزرگ (ضلع سمستی پور)میں اور تین سال منوروا(ضلع سمستی پور) میں گذارے، حضرت مولانا احمد حسن صاحبؒ اپنے نانا کے حکم پر یہاں تشریف لائے اور منوروا میں قیام فرمایا، نانا کے وصال کے بعد یہاں سے ہجرت کا ارادہ فرمایا، لیکن بزرگوں کے حکم اور اشارۂ غیبی کے تحت ان کو یہیں قیام کرنا پڑا کہ ابھی حضرت مولانا امیر الحسن قادری کے دینی اور اصلاحی مشن کا کام باقی تھا، پھر اللہ پاک نے منوروا میں کاشانۂ حضرت احمد حسنؒ کو وہ دینی اور روحانی مرکزیت بخشی کہ پورے شمالی بہار سے بنگال تک اس کے فیوض کی نہریں پہونچ گئیں اور منوروا جیسی چھوٹی سی بستی مرجع عام وخاص بن گئی۔

رابطہ منزل بمنزل

اس پہلی ملاقات کے بعد ہی مفتی صاحب سے ایسی مناسبت پیدا ہوئی کہ جیسے وہ میرے خاندان ہی کے فرد ہوں پھر گاہے گاہے آمد ورفت کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا ،البتہ مفتی صاحب سے میرا کوئی درس متعلق نہیں تھا، وہ صرف درجۂ افتاء کے طلبہ کو

پڑھاتے تھے ،اس لئے آمدورفت میں اکثروقفہ ہوجاتا تھا،ان سے ہمارا رابطہ صرف انجمن کی حد تک تھا ،وہ ہماری انجمن تہذیب البیان (طلبۂ دربھنگہ ،سمستی پور ،مدھوبنی)کے سرپرست تھے،لیکن مجھے انجمن سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی، کبھی کبھی رسم پوری کرنے کے لئے شرکت کرلیا کرتا تھا،لیکن دورۂ حدیث شریف کے سال جب مجھ پر انجمن کے قلمی ماہنامہ "افکار" کی ادارت کا بوجھ ڈال دیا گیا،تو نسبتاً انجمن سے بھی اور اس کے حوالہ سے مفتی صاحب سے بھی رابطہ بڑھ گیا، آمدورفت بھی کچھ زیادہ ہوگئی ،اس دوران مفتی صاحب سے بعض قلمی اصلاحات لیں ۔۔۔دورۂ حدیث کے سالانہ امتحان میں مجھے امتیازی کامیابی ملی اور دوسری پوزیشن حاصل ہوئی،دارالعلوم کے ضابطہ کے مطابق دورۂ حدیث میں امتیازی نمبرات حاصل کرنے والے طلبہ کو دارالعلوم میں معین المدرس بننے کا اعزاز بخشا جاتا تھا،مجھ سے بھی کہا گیا لیکن ایک تو میری عمر کم تھی ،دوسرے مجھے افتا پڑھنے کی خواہش تھی،اس لئے میں نے اس کے بجائے افتا میں داخلے کے لئے درخواست دے دی،صوبۂ بہار سے تقریباً ۴۸ طلبہ داخلہ کے امیدوار تھے اور اس معیار پر اترتے تھے،لیکن کوٹہ کے مطابق بہار سے صرف ایک ہی طالب علم لیا گیا ،اور تنہا میرا انتخاب عمل میں آیا

مفتی صاحب سے باقاعدہ استفادہ کا آغاز

اب حضرت مفتی صاحب کے پاس براہ راست میرا درس شروع ہوا،پہلی گھنٹی درمختار کی مفتی صاحب سے متعلق ہوئی، تمرین فتاویٰ کے لئے بھی میرا نام مفتی صاحب ہی کے پاس منتخب ہوا، عموماً بعد نماز ظہر تا عصر ہم لوگ مشق فتاویٰ کے لئے دارالافتاء میں

رہتے تھے، مفتی صاحب نہ صرف قدیم مسائل پر ہم لوگوں سے کام لیتے بلکہ بہت سے نئے مسائل بھی زیر بحث لاتے، اور ان پر غور وفکر کا طریقہ سمجھاتے، یوں تو مفتی صاحب کی شفقت بیکراں سب طلبہ ہی پر تھی، لیکن میرے خاندانی پس منظر کی بناپر مجھ سے بہت زیادہ محبت فرماتے تھے، مجھ پر ان کو اعتماد بھی بہت زیادہ تھا، اسی وجہ سے اپنے کئی علمی اور تحقیقی کاموں میں مجھے شرکت کا موقعہ دیتے تھے،

مفتی صاحب کا حافظہ اور علمی استحضار

مثلاً ان دنوں مفتی صاحب فتاویٰ دارالعلوم کی تیرھویں جلد (کتاب الوقف) کی ترتیب کا کام کررہے تھے، میں اکثر بعد نماز مغرب تاعشاان کے کام میں شریک ہوتا اور ان کے طریقۂ کار سے استفادہ کرتا، حالانکہ مفتی صاحب بڑھاپے کی منزل میں تھے اور حوادث روزگار نے ان کو توڑ کر رکھ دیا تھا، لیکن ان کی ہمت وعزیمت اور ہر کام میں وقت اور اصولوں کی پابندی قابل رشک تھی، مطالعہ وسیع اور ذہن پوری طرح حاضر تھا، فتاویٰ شامی تو جیسے پوری ازبر تھی، وہ کبھی کوئی حوالہ فہرست کی مدد سے نہیں نکالتے تھے، بلکہ براہ راست صفحات الٹتے اور ایک دو صفحہ کے فرق سے وہ حوالہ مل جاتا تھا، یہ میرا روز کا مشاہدہ تھا اور وہ بھی وقف اور مساجد جیسے خشک اور مشکل موضوعات میں آسان بات نہ تھی، کبھی میں کوشش کرتا کہ فہرست کے ذریعہ کوئی حوالہ نکالوں، لیکن تجربہ کی کمی کی بناپر تاخیر ہوتی لیکن ان کے لئے یہ کوئی مسئلہ نہ تھا، میں نے بارہا دیکھا کہ استفتا کے جواب میں شامی یا عالمگیری کی پوری عربی عبارت حافظہ کی مدد سے لکھ دیتے، جلد کی تعیین بھی فرمادیتے، صرف صفحہ نمبر کے لئے ہم لوگوں کو کتاب سے مراجعت کرنی پڑتی تھی۔

سلف ہر حال میں خلف پر فضیلت رکھتے ہیں

مفتی صاحب کو دیکھ کر میرے اس نظریہ کو تقویت ملی کہ بعد کے لوگ وسائل وذرائع کی فراوانی کے باوجود پہلے والوں کے علم و فضل کو پا نہیں سکتے، اللہ پاک نے زمانی تقدم میں وہ برکت وفضیلت رکھی ہے جس کا کوئی متبادل دنیا میں موجود نہیں ہے، اسی لئے ہر زمانہ میں خلف اپنے سلف کا احترام کرتے چلے آئے ہیں، سلف ہی اپنے اخلاف کے لئے سچے آئیدیل ہوتے ہیں، ہر نیا عہد اپنے پہلے عہد کے سانچے میں ڈھلتا ہے اور ہمیشہ نقش ثانی نقش اول کو دیکھ کر تیار کیا جاتا ہے، حال ہمیشہ ماضی کا آئینہ دار ہوتا ہے، دین و اخلاق کا معاملہ تو کچھ زیادہ ہی حساس ہے، ان کی جڑیں تو ہر حال میں ماضی کی خاک میں پیوست ہیں، سلف سے رشتہ کاٹ لیا جائے تو ان میں اور کٹی ہوئی پتنگ میں کوئی فرق باقی نہ رہ جائے گا، دین واخلاق اور علم و عمل کے اعتبار سے اب کوئی ترقی ہونے والی نہیں ہے، ہر آنے والا وقت معنوی طور پر زوال کی سمت جاتا ہے اور ہر نئے دور کا معیار پچھلے دور سے فروتر ہوتا ہے، یہ وہ تاریخی سچائی ہے جس پر ہر آنے والی گھڑی مہر تصدیق ثبت کررہی ہے، اسی لئے جب کبھی بعد والوں نے اپنے پہلے والوں پر نکتہ چینی کی ہے اور ان کے کئے ہوئے کاموں میں کیڑے نکالے ہیں، تو امت نے اسے مسترد کردیا ہے اور اس کو اس حدیث کا مصداق قرار دیا ہے،۔۔۔۔۔

وَلَعَنَ آخِرُ هَذِهِ الأُمَّةِأَوَّلَهَافَلْيَرْتَقِبُواعِنْدَ ذَلِكَ رِيحًاحَمْرَاءَ أَوْخَسْفًاوَ مَسْخًا». قَالَ أَبُو عِيسَى هَذَا حَدِيثٌ غَرِيبٌ لانَعْرِفُهُ مِنْ حَدِيثِ عَلِيِّ بْنِ أَبِى طَالِبٍ إِلاَّ مِنْ هَذَا الْوَجْهِ[2]

---

[2] - سنن الترمذي]الكتاب : الجامع الصحيح سنن الترمذي ،المؤلف :محمد بن عيسى أبو عيسى الترمذي السلمي ،الناشر : دار إحياء التراث العربي – بيروت۔

ترجمہ: جب اس امت کے آخری دور کے لوگ اس امت کے اولین لوگوں پر لعنت بھیجنے لگیں تو پھر لوگ سرخ ہوا، زمین میں دھنسائے جانے اور صورتیں مسخ کئے جانے کا انتظار کریں۔

اپنے بزرگوں کے چھوڑے ہوئے کاموں کی تکمیل کی جائے گی، ان کو ناقص نہیں بتایا جائے گا، یہ چھوٹوں پر بزرگوں کا حق بنتا ہے اور جو حضرات ان حدود کی رعایت نہیں کرتے وہ حق تلفی کے گنہ گار ہوتے ہیں، مجھے اس موقعہ پر شیخ عبد الفتاح ابو غدہؒ کی بات یاد آتی ہے، جو آب زر سے لکھے جانے کے لائق ہے:

شیخ نے حضرت علامہ عبدالحی فرنگی محلیؒ کی شہرۂ آفاق کتاب "الرفع والتکمیل فی الجرح والتعدیل "اپنی تحقیق وتعلیق کے ساتھ شائع کی، تو شیخ کی تحقیقات کا حجم اصل کتاب سے کئی گنا زیادہ ہو گیا، کسی صاحب علم نے ان کو مشورہ دیا کہ اپنی تحقیقات کو اس کتاب کا حاشیہ بنانے کے بجائے مستقل کتابی صورت میں شائع کر دیں ،تو شیخ نے جواب دیا کہ(اتمام بناء الآباء خیرمأ ة مرة من انشاء البناء من الابناء)"باپ دادا کے پرانے مکان کی مرمت کرنا سو بار نیا مکان بنانے سے بہتر ہے"[3]

اختلاف کے حدود

میں نے مفتی صاحب کی صحبتوں میں محسوس کیا کہ بزرگوں کا احترام کیسے کیا

---

[3] - مقدمہ تحقیق الرفع والتکمیل فی الجرح والتعدیل للامام عبدالحی اللکنوی (متوفی ۱۳۰۴ھ)، تحقیق شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ (وفات ۱۴۱۷ھ) ص ۶، ناشر: مکتب المطبوعات الاسلامیۃ، بیروت، ۲۰۰۴ء

جاتا ہے ؟کسی مسئلے میں علمی اختلاف بھی ہو تو اس کے اظہار کے آداب کیا ہیں ؟مفتی صاحب بھی کئی مسائل میں اپنی ایک رائے رکھتے تھے ، مگر کبھی انہوں نے ان کی بنیاد پر اپنے مخالفین کے ساتھ توہین کا رویہ اختیار نہیں کیا، مفتی صاحب کے رجحانات ان کی اپنی فکر کی پیداوار تھے ،ان میں کسی منفیت کا دخل نہیں تھا،یوں بھی مفتی صاحب صلح کل انسان تھے، ہزار رنج سہنے کے باوجود مزاج کی نرمی اور اخلاق کی بلندی میں فرق نہیں آتا تھا، اپنے سخت سے سخت مخالف سے ایسی خندہ پیشانی سے ملتے کہ وہ شرم سے پانی پانی ہو جاتا، ان کا تحمل ہی ان کی شخصیت کا حصار تھا، ورنہ زندگی میں بالخصوص دیوبند میں جن حالات سے وہ دوچار ہوئے اور جیسی آزمائشوں سے انہیں گذرنا پڑا کہ ان کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو اس کے قدم اکھڑ جاتے ،۔۔۔۔۔مفتی صاحب ایک طویل عرصہ تک دارالعلوم دیوبند میں رہے ،اس دوران وہاں کے نظم وانتظام کے معاملات میں کئی بار اتھل پتھل آئی ، طلبہ کی اسٹرائیکیں ہوئیں ، انقلابات آئے ، انتظامیہ بدلی ، مگر مفتی صاحب کا طرز عمل ہمیشہ دارالعلوم کے حق میں مخلصانہ اور منتظمین کے حق میں وفادارانہ رہا، انہوں نے کبھی دارالعلوم کی عزت ووقار پر اپنی ذات سے کوئی سوالیہ نشان لگنے نہ دیا، ایک موقعہ پر میڈیا کی طرف سے ایک سازش کے تحت دارالافتا کے خلاف فتووں کی خرید وفروخت کا الزام لگایا گیا اور اس کو کافی ہوا دی گئی ، لیکن اس میں مفتی صاحب کا نام کہیں نہیں آیا، اللہ پاک نے آپ کی حفاظت فرمائی ، جبکہ وہ اس وقت دارالعلوم کے سب سے سینئر مفتی تھے۔

صبر واستقامت کے پیکر

مفتی صاحب نے ساری زندگی ایک جاں نثار سپاہی کی طرح دارالعلوم کی خدمت کی اور کہیں پلٹ کر کسی صلہ یا ستائش کے طلب گار نہ ہوئے اور نہ اس سلسلے میں کسی طعن و تشنیع کی پرواہ کی، مفتی صاحب اکثر فرمایا کرتے تھے کہ دارالعلوم میں میری ملازمت ہوئی، تو حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ کا دور اہتمام تھا، لیکن دارالعلوم کے صدرالمدرسین اور شیخ الحدیث حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ روحانیت اور تزکیۂ اخلاق کے باب میں مرجع خاص وعام تھے، حضرت مدنیؒ کی شخصیت سے میں بھی متاثر ہوا اور ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گیا، حضرت مدنیؒ کے وصال کے بعد اس انتساب کی بنیاد پر مجھے دارالعلوم کی انتظامیہ مدنی گروپ کا آدمی تصور کرتی تھی، کچھ عرصہ کے بعد میں حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ سے باقاعدہ منسلک ہو گیا، بعد میں اجازت وخلافت سے بھی سرفراز ہوا، اب آج کی انتظامیہ (موجودہ مدنی گروپ) مجھے قاری طیب صاحبؒ کے گروپ کا آدمی سمجھتی ہے، جبکہ ہر انتظامیہ کے ساتھ میرا تعاون بدستور قائم رہا اور انتظامیہ نے مجھ سے پورا کام لیا لیکن غیریت کی دیواریں پھر بھی قائم رہیں، یہ میری زندگی کا بڑا المیہ ہے۔

۱۹۸۳ء کے انقلاب میں دیگر علمی اثاثوں کے ساتھ مفتی صاحب کی خود نوشت سوانح حیات بھی ضائع ہو گئی، اگر وہ کتاب آج موجود ہوتی تو مفتی صاحب کی زندگی کے کئی گم شدہ حصے روشنی میں آتے اور بہت سے رازہائے سربستہ سے پردہ اٹھتا، مفتی صاحب نے قریب نصف صدی تک دارالعلوم کی خدمت کی، ان کی زندگی دارالعلوم کے قریب

پچاس سالہ دور کی خاموش تاریخ تھی، جس پر مصلحتوں کی دبیز چادریں پڑی رہتی تھیں، ہندوستان کی جنگ آزادی سے لیکر دارالعلوم کے عہد انقلاب تک بہار وخزاں کے نہ معلوم کتنے موسم انہوں نے دیکھے تھے، کتنے ہی اداروں اور شخصیات کے عروج وزوال کے مشاہدات کی تاریخ ان کی نگاہ میں تھی، انہی چیزوں نے ان کی فکر وزبان کو بہت محتاط بنادیا تھا، وہ عام حالات میں کسی پر تبصرہ کرنا پسند نہیں کرتے تھے، وہ کتاب وقلم کے آدمی تھے، میں نے جب دیکھا کوئی کتاب ان کی آنکھوں سے لگی ہے یا پھر قلم ان کی انگلیوں میں جنبش کررہا ہے۔

مفتی صاحب کی مجلسیں

عصر سے مغرب تک بالعموم ان کے یہاں مجلس لگتی تھی، جس میں کچھ بے تکلف طلبہ شریک ہوتے تھے، ان کے دوستوں میں اکثر فضلو بھائی (جناب مولانا فضل الرحمن صاحب در بھنگوی استاذ شعبۂ خطاطی دارالعلوم دیوبند)، حکیم عزیز الرحمن صاحب اعظمیؒ سابق پروفیسر طبیہ کالج دارالعلوم دیوبند و محقق شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند)شریک رہتے تھے، کبھی کبھی حضرت علامہ مولانا محمد حسین بہاری صاحبؒ محدث دارالعلوم دیوبند بھی مجلس کو رونق بخشتے تھے، بڑی سادہ اور بے تکلف مجلس ہوا کرتی تھی، مفتی صاحب کی طرف سے چائے کا دورانیہ ہوتا تھا اور کسی شریک مجلس کی طرف سے چائے کے لوازم کا انتظام کیا جاتا تھا، مختلف موضوعات پر کھل کر گفتگو ہوتی تھی، ہر شخص کو اظہار خیال کی آزادی ہوتی۔

حکیم عزیز الرحمن صاحب: بڑے مجلسی آدمی تھے، لطائف وظرائف

کی ان کے پاس کمی نہیں تھی، ان کی ایک ایک بات پر کبھی پوری مجلس قہقہہ زار ہو جاتی ،نادر تجربات اور تاریخی واقعات کا پورا خزانہ ان کے دماغ میں محفوظ تھا، باتیں ایسے پتے کی کرتے کہ رگ دانش پھڑک اٹھتی، ان کی زندگی میں بڑا غم تھا، اپنوں کے ہاتھ ہی بہت سے دکھ سہے تھے، لیکن ان کی مسکراہٹیں ان کے غموں کے لئے حجاب تھیں، مجھ سے بہت بے تکلفی تھی میں نے اکثر محسوس کیا کہ ان کی ہنسی میں بھی آنکھوں کی نمی نہیں جاتی اور مسکراتے ہوئے بھی ان کی شخصیت کے نہاں خانے سے اداسیاں جھانکتی رہتی تھیں،۔۔۔ آج وہ ہم میں نہیں ہیں تو ان کی ایک ایک بات یاد آتی ہے، میں ان کا بہت مداح تھا اور کبھی مجلس میں نہ ہوتے تو بڑی کمی محسوس ہوتی تھی، دیوبند کے بحر ناپیدا کنار میں آج بہت کچھ ہے لیکن وہ در آبدار کہیں نظر نہیں آتا۔

مولانا فضل الرحمن صاحب: (فضلو بھائی) خاموش طبع آدمی تھے، مفتی صاحب کے ہم خیال، ان کی تحریروں کے مزاج شناش اور علمی امور کی اشاعت میں ان کے دست راست تھے، بہت نیک صالح آدمی تھے، دیوبند کے ایک محلہ میں کرایہ پر رہتے تھے، بولتے کم تھے مگر سننے کا حوصلہ وسلیقہ قابل رشک تھا، ہر ایک کی بات پوری بشاشت کے ساتھ سنتے، میں ان کے اس حوصلہ کی داد دیتا تھا، واقعی فضلو بھائی بڑی فضیلتوں کے مالک تھے۔

حضرت علامہ مولانا محمد حسین بہاریؒ

حضرت علامہ بہاریؒ تو استاذ الاساتذہ ہی تھے، دارالعلوم میں ہر شخص ان کا احترام کرتا تھا، وہ جس کو چاہتے تنبیہ کرسکتے تھے، ان کے سامنے کسی کو پر مارنے کی مجال

نہیں تھی، بارہا میں نے بزرگ اساتذہ پر بھی ان کی چھڑی اٹھتے ہوئی دیکھی اور ہر آدمی پوری بشاشت وسعادت مندی کے ساتھ اسے قبول کرتا، اس شان وصفات کی شخصیت پورے دیوبند میں اس وقت حضرت علامہؒ کے سوا کوئی نہ تھی، بے پناہ ضعف وپیری کے باوجود درس اور نماز باجماعت پر ان کی استقامت ضرب المثل تھی، یہ ان کے تقویٰ اور مقام ولایت کی علامت تھی، یہ بات میں نے نہ اس دور کے دیوبند میں دیکھی اور نہ اس کے بعد کہیں، حضرت علامہؒ کو دیوبند کی مٹی سے اتنا پیار تھا کہ اس میں دفن ہونے کی آرزو میں دیوبند سے باہر ہر طرح کی طویل آمد ورفت چھوڑدی تھی، اپنی موت کے بارے میں ان کی دو تمنائیں کافی مشہور تھیں، ایک یہ کہ حدیث پڑھاتے ہوئے ان کی موت ہو، دوسرے دیوبند کی مٹی میں اپنے مشائخ کے جوار میں دفن ہوں، اللہ پاک نے ان کی دونوں آرزوئیں پوری فرمائیں، فرحمہ اللہ۔

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی تمنا ہو تو دیکھ ان کو
ید بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں
تمنا درد دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

حضرت علامہ علماء ومحدثین دیوبند میں بلند مقام کے حامل تھے، افسوس ان کے افادات ترمذی وابوداؤد محفوظ نہ رہ سکے کہ آج کی نسلوں کو بھی ان کے علمی مقام ومرتبہ کا اندازہ ہوتا، البتہ ان کے تلامذہ جانتے ہیں کہ ان کا درس کس قدر جامع اور علوم ومعارف کا گنجینہ ہوتا تھا، مختصر جملوں میں بڑی بڑی بحثوں کا خلاصہ پیش کردیتے تھے، ان کی چند سطریں گھنٹوں کی تقریروں پر حاوی ہوا کرتی تھیں اور اتنے جچے تلے انداز اور سادہ

لب ولہجہ میں گفتگو کرتے کہ ہر طالب علم کے لئے وہ قابل فہم ہوتی تھی، اہم بات یہ تھی ان کا درس محض چند نقول کا مجموعہ نہیں ہوتا تھا، بلکہ اس میں اجتہادی شان نمایاں ہوتی تھی، اس میں محدثین وفقہاء کی آراء کے ساتھ خود علامہ کے علم وحکمت کے بحر ذخار کی جولانی بھی شامل ہوتی تھی، نیز ان کی آواز کی گھن گرج اور الفاظ وتعبیرات اور لب ولہجہ کی شوکت اس میں وہ اثر انگیزی پیدا کرتی کہ سلف صالحین کی یاد تازہ ہو جاتی تھی، پورے حلقۂ دیوبند وسہارن پور میں ان کے درس ترمذی کو امتیازی شہرت حاصل تھی، میں نے جو ان کا دور پایا ان کا زور اور شباب رخصت ہو چکا تھا، ضعف وپیری کا غلبہ تھا، نیز حالات کی نبرد آزمائیوں نے ان کو دل شکستہ کر دیا تھا، اکابر اور اکثر معاصرین کے رخصت ہو جانے کے بعد وہ اپنے کو تنہا محسوس کرتے تھے، اب زندگی سے ان کی وابستگی ایک مسافرانہ توقف سے زیادہ نہ تھی، کہہ سکتے ہیں کہ ایک چل چلاؤ کا وقت تھا، میں نے ان سے ترمذی کے بجائے ابوداؤد پڑھی ہے، لیکن جس اعتماد اور جامعیت کے ساتھ وہ بحث کرتے تھے اور موضوع پر مکمل حاوی ہو کر گفتگو فرماتے اور کلیات وجزئیات کا احاطہ فرماتے کہ ان کا درس آواز کی نقاہت کے باوجود سب سے منفرد اور سب سے مکمل ہوتا تھا، ان کا درس محفوظ کر لینے کے بعد ان مسائل میں کسی کے درس کی علمی حاجت باقی نہیں رہ جاتی تھی ،اس بات کا زیادہ اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب میں نے امتحان کے موقعہ پر حضرت علامہؒ کے افادات کے نوٹس کا مطالعہ کیا، میری عادت اپنے اساتذہ اور مشائخ کی درسی تقریریں نوٹ کرنے کی تھی، تو علامہ کے دروس کی جامعیت دیکھ کر حیران رہ گیا، کھنڈرات کے اس تب وتاب سے عہد شباب کے شان وشکوہ کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، میں نے سوچا حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ صدرالمدرسین وشیخ الحدیث

دارالعلوم دیوبند نے عرب مہمانوں کے سامنے علامہ کا تعارف ان لفظوں میں یوں ہی نہیں کرایا تھا "هذاامام المنطق والفلسفة " یہ اس دور کی بات ہے جب حضرت علامہ سے زیادہ تر منطق وفلسفہ کی کتابیں متعلق تھیں اور علامہ نے اس فن میں وہ دھوم مچائی تھی کہ خیر آباد اور ٹونک کی درسگاہوں کی یاد تازہ ہوگئی تھی ،۔۔۔پھر جب فن حدیث میں قدم رکھا تو دیوبند کی درسگاہ حدیث کا وقار بلند کیا اور حضرت نانوتویؒ، حضرت شیخ الہندؒ، حضرت علامہ کشمیریؒ، حضرت عثمانیؒ، حضرت مدنیؒ اور حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ کے درس حدیث کے تاریخی تسلسل کو آگے بڑھایا، ان کے طرز تدریس کو فنی بلندی اور علوم وافکار کو وسعت وگہرائی بخشی، اللہ پاک ان کی قبر کو نور سے بھر دے اور اپنے کرم کی آغوش میں ان کو جگہ عنایت فرمائے آمین۔

حضرت علامہؒ کبھی بظاہر تلخ لب ولہجہ میں بھی بات کرتے تھے، مگر اس میں بھی ان کی شفقت پوشیدہ ہوتی تھی، بظاہر بہت بارعب لیکن اندر پھول سے بھی زیادہ نرم، ہر ایک کے مخلص وخیر خواہ، میں ایک کم عمر طالب علم تھا اور ان کا ادنیٰ ترین شاگرد، لیکن بہت محبت فرماتے تھے، زجر وتوبیخ سے بھی نوازتے تھے اور تحسین بھی فرماتے تھے ،میری پہلی کتاب "منصب صحابہ "(جو اصلاً عہد طالب علمی کی تالیف ہے) کی اشاعت کی نوبت آئی تو بزرگوں سے تقریظات لکھوانے کی میں نے کوشش کی، میری خواہش تھی کہ حضرت علامہؒ سے بھی درخواست کروں، بعض لوگوں نے مجھے ڈرایا کہ وہ تقریظ جلدی لکھتے نہیں ہیں، لیکن میں نے ہمت کرکے ان سے درخواست کی اور اپنی کتاب کا کتابت شدہ مسودہ ان کو دکھلایا، انہوں نے بہت پسند کیا اور بآسانی تقریظ لکھنے کے لئے راضی ہوگئے اور خلاف توقع زوردار تقریظ لکھی اوراس کو اپنے موضوع کی پہلی کتاب قرار دیا۔

مفتی صاحب کی علمی شخصیت اور علاقائی تعلق کی بناپر کبھی کبھی حضرت علامہ عصر کے بعد کی مجلس میں مفتی صاحب کے یہاں تشریف لاتے تھے، مفتی صاحب علامہ کا بہت زیادہ احترام فرماتے تھے، جب تک وہ مجلس میں ہوتے زیادہ گفتگو نہیں کرتے تھے، مرکزی جگہ پر حضرت علامہؒ کے لئے گاؤ تکیہ رکھ دی جاتی اور وہ اس پر نیم دراز کیفیت میں تشریف رکھتے تھے، ان کی عصا ان کے پاس ہوتی، جو بات کسی کو تفہیم سے سمجھ میں نہ آتی وہ ان کے ڈنڈے سے سمجھ میں آجاتی تھی، ایسی برکت والی چھڑی وہ بھی بڑی عمر والوں کی تنبیہ کے لئے ان کے بعد کبھی نہیں دیکھی۔

جب یہ مجلسیں میری قیام گاہ پر ہونے لگیں

جب میں دارالعلوم میں معین المدرس ہوا تو مفتی صاحب کی یہ مجلسیں اکثر میری قیام گاہ (دار جدید کمرہ نمبر ۲) میں منعقد ہونے لگیں، مگر ان میں حضرت علامہؒ بوجہ ضعف کبھی تشریف نہ لاسکے، البتہ شرکاء میں میرے دوست مولانا طارق بن ثاقب پورنوی کا اضافہ ہوا، جو میرے بڑے قدردان تھے، میں بھی ان کے فکر وفن اور شعری صلاحیتوں کا بہت قائل تھا، طارق صاحب کی وجہ سے اکثر یہ مجلسیں ادبی نشستوں میں تبدیل ہوجاتی تھیں، ان کا یہ شعر میرے نہاں خانۂ ذہن میں آج بھی تروتازہ ہے:

طویل عمر ہے درکار اس کے پڑھنے کو
ہماری داستاں اوراق مختصر میں نہیں

اللہ پاک ان کو جزائے خیر سے نوازے، جامعہ ربانی قائم ہوا تو کچے دھاگے میں بندھے ہوئے وہ منوروا چلے آئے، جامعہ کے ایک سالانہ جلسہ میں شریک ہوئے اور اپنا

یادگار ترانہ جامعہ کو پیش کیا، جس کو آج بھی ہمارے طلبہ اپنے پروگراموں میں گنگناتے ہیں، انٹرنیٹ پر بھی اس ترانہ کو سنا جاسکتا ہے، اس کے چند اشعار یہ ہیں:

یہ منبع علم وعرفاں ہے ، یہ مظہر دین ہدایت ہے
یہ مرکز دعوت وایماں ہے، یہ مخزن فہم وفراست ہے
یہ گلشن دین محمد کی ہے باد بہاری کا مسکن
ہر رنگ کے پھولوں کا مخزن، ہر پھول کی خوشبو کا مامن
یہ نسبت ساقی کوثر سے احمدؔ کا حسیں میخانہ ہے
لبریز خلوص باطن سے محفوظؔ کا ہر پیمانہ ہے
سرخیل ہیں جس کے امیر حسنؔ، تابندہ روایت کے حامل
مقبول دعاؤں کے طالب ، پائندہ سعادت کے حامل
اخترؔ کی عزیمت وکاوش کا بے مثل حسیں شہکار ہے یہ
پھیلائے گا علم وعرفاں کا، جو نور وہی مینار ہے یہ

کبھی کبھی یہ مجلس خالص ادبی رنگ اختیار کرلیتی تھی، اس میں زیادہ تر دخل حکیم عزیز الرحمن صاحب اور مولانا طارق بن ثاقب کی ادبی دلچسپیوں کا ہوتا تھا، تنقیدی ادب میں ان حضرات کا شعور کافی بلند تھا، کبھی کبھی میں بھی اپنی کوئی چیز پیش کردیتا۔

زندگی کا پہلا سفر نامہ

مجھے خوب یاد ہے کہ انہی دنوں میں نے پہلی بار آگرہ کا سفر کیا تھا، بہت دنوں سے ہندوستان کی عجوبۂ روزگار اور تاریخی شاہکار عمارت تاج محل دیکھنے کی آرزو میرے

دل میں تھی، جو شاہ جہاں اور ممتاز محل کی محبت کی بے مثال نشانی کے طور پر ساری دنیا میں مشہور ہے، دارالعلوم کے امتحان شش ماہی کی فرصت میں میں نے سفر کا پروگرام بنایا ،جناب مولانا محمد شمیم آزاد مدھوبنی[4] بھی اس سفر میں شامل ہوئے ، اس طرح دو رکنی قافلہ دیوبند سے چل کر آگرہ وارد ہوا ،جناب مولانا قاری شفیق صاحب سابق معین القاری اور حال استاذ شعبۂ قرأت دارالعلوم دیوبند اس وقت آگرہ کے ایک مدرسہ میں جو تاج کے قریب واقع تھا استاذ تھے ،وہ ہمارے میزبان ہوئے ،دیوبند کے زمانۂ قیام میں ہم لوگوں کا باہم اچھا تعلق تھا، انہوں نے ہمارے حسب حال بہترین ضیافت کی اور تاج کی زیارت کا بھی انتظام کیا، اس زمانے میں تاج کی زیارت کے لئے صرف دو روپے کا ٹکٹ لگتا تھا، وہ بھی کسی معمولی تعلق کی بناپر اکثر نظر انداز کر دیا جاتا تھا، ہم لوگوں نے دن کے علاوہ شب میں بھی چاندنی میں ڈوبے ہوئے تاج کا نظارہ کیا، تاج کی پہلی زیارت ہی پر اس تعلق سے جتنے افسانے سنے تھے سچ معلوم ہوئے ، میں تاج محل کی تعمیر، پس منظر اور اس کے حسن و دلکشی سے بے حد متاثر ہوا، آگرہ سے واپسی پر میں نے ایک خوبصورت سفر نامہ لکھ ڈالا ،عنوان تھا " ایک سفر منزل آرزو کی طرف " یہ سفر نامہ سے زیادہ اپنے جذبات واحساسات کا اظہار اور تاج محل کی عظمت کو ایک طرح کا خراج عقیدت تھا اور شائع کرنے کے لئے نہیں بلکہ اپنے جذبات محبت کی تسکین اور ان یادگار لمحات کو قرطاس و قلم کی قید میں لانے کی غرض سے لکھا گیا تھا، ایک دن مجلس میں سفر آگرہ کا ذکر آگیا اور اسی ضمن میں اس روداد سفر کا بھی ، مجھے علم وادب کی ان عظیم ہستیوں کے سامنے اپنی

---

[4] - یہ سن فراغ میں مجھ سے ایک سال متاخر اور دارالعلوم دیوبند میں میری طرح معین المدرس تھے، اور اب دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد کے شیخ الحدیث ہیں۔

ٹوٹی پھوٹی تحریر پیش کرنے میں تامل تھا، لیکن حکیم عزیز الرحمن صاحبؒ کی ادب نواز اور اس سے زیادہ دلنواز شخصیت بھی موجود تھی ،انہوں نے اس تحریر کو پیش کرنے پر اصرار کیا، دیگر ارکان مجلس بھی میرے کمرہ ہی میں موجود تھے ،اس لئے کوئی عذر قابل قبول نہ ہو سکا، میں نے وہ پوری تحریر اسی مجلس میں سناڈالی ،جب میں فارغ ہوا تو تحسین وآفرین کی زور دار صدائیں بلند ہوئیں، مفتی صاحب نے اس کو ایک شاہکار تحریر قرار دیا ،میرے کئی علم دوست احباب نے کہا کہ تاج محل کے مطالعہ کا ایک نیا زاویہ آپ نے پیش کیا ہے، کئی دوستوں نے اس کو تاج کا ایک بہترین تعارف قرار دیا، متعدد دوستوں کو اس سفر نامہ سے تاج کی زیارت کا شوق پیدا ہوا، مفتی صاحب کی تحریک پر میں نے یہ سفر نامہ دارالعلوم کے پندرہ روزہ اخبار "آئینۂ دارالعلوم" میں اشاعت کے لئے دے دیا ،آئینہ کے ایڈیٹر مولانا کفیل احمد علوی بڑے صاحب قلم اور بصیرت نگار شاعر تھے، ان کا یہ شعر آج تک میں بھول نہ سکا جو آئینہ کی کسی اشاعت کی پیشانی کی زینت بنا تھا:

کفیلؔ چاہے خلاف ادب سہی لیکن
حریم ناز کے پردے اٹھا دیئے میں نے

ان کا رویہ طلبۂ دارالعلوم کے ساتھ بہت فراخ دلانہ تھا، وہ لکھنے والے طلبہ کی کافی حوصلہ افزائی فرماتے تھے ،اسی لئے مجھ سے بھی محبت فرماتے تھے ،ہمارے دور میں طلبہ میں اس ذوق فراواں کی کافی کمی تھی، اس لئے ہم لوگوں کی الٹی سیدھی تحریریں بھی بڑے شوق سے وہ پڑھتے اور نوک و پلک درست کرکے شائع کرنے میں خوشی محسوس کرتے تھے ،میری تحریروں کو وہ بے تکلف اور من و عن شائع کرنے کے عادی تھے ، لیکن کسی طالب علم کا سفر نامہ شائع ہو ، عجیب بات تھی ، آج بھی جب یہ سطریں لکھ رہا

ہوں ان کی محبت کی مٹھاس دل میں اترتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، اگر ان بزرگوں کی محبت قدم قدم پر اس طالب علم کے شامل حال نہ ہوتی تو آج یہ بڑی تحریریں لکھنے کے لائق نہ ہوتا، مولانا کفیل صاحب سفر نامہ دیکھ کر مسکرائے، اس پر ایک نظر ڈالی اور فرمایا، جایئے، اگلی اشاعت میں اسے شامل کر دوں گا، سفر نامہ شائع ہوا، بزرگوں نے بھی بڑی حیرت کے ساتھ اس کو پڑھا، زندگی کا پہلا سفر نامہ، اس سفر نامہ کی اشاعت کے بعد حضرت الاستاذ مولانا معراج الحق صاحب صدرالمدرسین دارالعلوم دیوبند سے ملنے گیا (حضرت سے گاہے گاہے ملاقات کرنا میرے معمول میں شامل تھا) تو دیکھتے ہی فرمایا "اچھا! اب تو آپ کے سفر نامے بھی شائع ہونے لگے "میں شرم سے پانی پانی ہو گیا ۔۔۔۔۔۔ حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند بھی مجھ سے بہت محبت فرماتے تھے، ہر ملاقات پر میری کسی نہ کسی تحریر کا تذکرہ کرتے اور تحسین فرماتے تھے، انہوں نے بھی اس سفر نامہ کا بڑی محبت کے ساتھ ذکر فرمایا، ۔۔۔۔۔ بزرگوں کی حوصلہ افزائی چھوٹوں کے لئے اکسیر ہوتی ہے، اور اسی کی بدولت وہ آسمان کی بلندیوں تک پہونچنے کا حوصلہ کرتے ہیں، اب نہ بڑوں میں وہ وسعت ظرفی اور نگاہ کریمانہ باقی رہی اور نہ چھوٹوں میں وہ احسان شناشی اور سعادت مندی۔

مجلس کے چند نو وارد احباب

مفتی صاحب کی یہ مجلسیں جب سے میرے کمرہ میں ہونے لگی تھیں، ان کی رونق میں روز بروز اضافہ ہونے لگا تھا، اس میں میرے دوستوں کی بھی ایک تعداد شریک ہونے لگی تھی، مفتی صاحب بھی خوش تھے کہ ضیافت کے بوجھ سے آزاد ہو گئے تھے، میرا

کمسن بھائی محبوب احمد فروغ قاسمی (موجودہ شیخ الحدیث دارالعلوم حسنیہ کیرالا) چائے تیار کرنے کی خدمت انجام دیتا تھا، میرے محرم راز مولانا حافظ محمد سعد اللہ القاسمی (مقیم حال دربھنگہ) میری طرف سے اشیاء خوردنی کا انتظام کرتے تھے، کبھی ان کا ساتھ مولانا محمد عرفان سعیدی القاسمی سوپولوی دربھنگوی (مقیم حال ریاض) اور مولانا اختر حسین قاسمی سہرساوی (مقیم حال آندھرا پردیش) بھی دیتے تھے، اس مجلس کے چند اور مخصوص شرکاء کے نام اور صورتیں بھی میرے حافظہ میں ہیں گویا اب بھی وہ ہماری بزم کا حصہ ہوں، ان میں مولانا فخر الاسلام قاسمی دربھنگوی (مقیم حال ریاض) مفتی ضیاء الحق مدھوبنی القاسمی مرحوم (سابق استاذ جامعہ حسینیہ رانچی) مولانا محمد شاہد ناصری الحنفی دربھنگوی (سابق مدیر تحریر ماہنامہ حج میگزین ممبئی) ڈاکٹر محمد وارث مظہری سمستی پوری (موجودہ اسسٹنٹ پروفیسر مولانا ابوالکلام آزاد اردو یونیورسیٹی حیدرآباد) وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اللہ پاک ان سب کو خوش اور آباد رکھے، اور ان کے دلوں کو بھی ماضی کی شاندار یادوں سے زندہ و تابندہ رکھے آمین۔

؎ تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں دفتر پارینہ را

ان مجلسوں کی اہمیت

مفتی صاحب کی ان مجالس سے ذاتی طور پر مجھے بہت فائدہ پہونچا، بہت سے تاریخی واقعات، ذاتی تجربات، مفتی صاحب کے مخصوص اساتذہ اور مشائخ کے حالات، علم و حکمت کے لعل و گہر، عبرت و موعظت کے جواہر ریزے جو بڑی کتابوں میں حاصل

نہ ہوسکتے تھے وہ ان مختصر سی مجلسوں میں حاصل ہو جاتے تھے، علم سینہ میں جو بات ہے وہ سفینہ میں کہاں؟ صحبتوں سے جو چیز ملتی ہے وہ کتابوں کی ورق گردانی سے کہاں؟ جو علم مشائخ کی صحبتوں سے ملتا ہے اور سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا ہے، اس میں معنویت بھی ہوتی ہے اور اثر آفرینی بھی، وہ دیرپا اور محفوظ بھی ہوتا ہے، اس میں قوت فکر بھی ہوتی ہے اور جذبۂ عمل بھی، نظریہ بھی ہوتا ہے اور طریق کار بھی، اس کی تفہیم کے لئے نہ کسی تفسیر کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ تشکیل کے لئے کسی تنظیم کی، یہی وجہ ہے کہ قرآن وسنت اور علوم اسلامیہ کی حفاظت کے لئے کتابوں پر انحصار نہیں کیا گیا بلکہ صحبت ولقا کو بنیادی اہمیت دی گئی، یہ سارا کا سارا دین جو آج ہمارے پاس کتابوں کے سفینوں میں محفوظ ہے صحبتوں کے ذریعہ سے ہم تک پہونچا ہے اور صحابہ کا یہی وہ امتیاز ہے جو امت میں کسی کو حاصل نہیں، اگر صحابہ کی جماعت درمیان سے ختم کردی جائے تو یہ سارا دین ہی بے بنیاد ہو کر رہ جائے گا۔

آج بزرگوں کی مجالس کی اہمیت ختم ہوتی جارہی ہے، لوگ قرطاس وقلم اور دیگر ذیلی چیزوں میں اپنے کو الجھائے ہوئے ہیں، اور اصل طریقۂ دین کو بھول بیٹھے ہیں، پہلے ایسا نہیں تھا، مشائخ کی مجلسیں آباد ہوا کرتی تھیں، لوگ ان کو اپنی دینی ضرورت کا حصہ سمجھتے تھے، اس کے لئے باقاعدہ وقت نکالا جاتا تھا، اور زندگی کے نظام العمل میں اس کی گنجائش رکھی جاتی تھی، آج دنیا کی لائبریریوں میں ملفوظات ومجالس کا جو بے پناہ ذخیرہ موجود ہے وہ امت کے اسی تعامل کا واضح ثبوت ہے، اگر آج بھی دین کو انہی برکتوں اور عملی صورتوں کے ساتھ محفوظ رکھنا ہے اور اس کو آنے والی نسلوں تک من وعن پہونچانا ہے تو ہمیں اسی طریقۂ زندگی کو اپنانا ہوگا جو ہم سے پہلے کے لوگوں نے اختیار کیا تھا، دین

کو کتابوں سے نہیں دین والوں کی زندگیوں سے لینا ہو گا، اور اسی فکر و عمل کو اعتبار حاصل ہو گا جو دین کے اصل حاملین کے ذریعہ آیا ہو، کتاب و قلم تحفظ دین کا محض ثانوی ذریعہ ہیں، اس کی وجہ سے اصل ذرائع دین کو فراموش کر دینا بہت بڑا دینی نقصان اور حماقت ہے، موجودہ حالات کی بے حسی پر کسی شاعر کا یہ طنز بڑی حد تک حقیقت معلوم ہوتا ہے:

نہ کتابوں سے، نہ وعظوں سے، نہ زر سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

اور یہ غالباً شیخ رومیؒ کی اس فکر کا عکس جمیل ہے، جو ان کے ایک مشہور شعر میں پیش کیا گیا ہے:

صد کتاب و صد ورق در نار کن
جان و دل باجانب دلدار کن

مفتی صاحب عہد سلف کی یادگار تھے

حضرت مفتی صاحب اسی عہد سلف کی باقیات صالحات میں سے تھے جن کی معنوی برکات نے دین کے پورے نظام کو سہارا دیا ہوا تھا، وہ انہی نظریات واقدار کے علمبر دار تھے جو ہر دور کے معتبر اصحاب دین کے رہے ہیں، وہ بزرگوں کی اس وراثت کو کسی آن اپنے سینہ سے الگ کرنے کے قائل نہ تھے، وہ نرم گو اور گرم جو انسان تھے، فکر وعقیدہ کی پختگی ان کے ایمان کا جزو تھا اور دینی تصلب سے دستبر دار ہونا ان کے اصولوں کے خلاف تھا۔

مفتی صاحب اس دور میں عباقرۂ روز گار میں تھے، مفتی صاحب کی شخصیت

پر بہت سے مضامین آئے ہیں، لیکن میں اپنی اس تحریر میں ان کی شخصیت کے ان عناصر اور اپنے ذاتی مشاہدات کے ان حصوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں، جن کو مفتی صاحب کا امتیاز اور انفرادیت کہا جا سکتا ہے اور جن کی بدولت علم وعلماء سے لبریز ہندوستان میں مجھے مفتی صاحب ایک تنہا انسان نظر آتے تھے، مثلاً:

تاریخی حسیت اور جذبۂ اعتراف کی بلندی

☆مفتی صاحب کی دینی و تاریخی حسیت اور جذبۂ اعتراف کی بلندی کافی نمایاں تھی، اسی کا اثر تھا کہ وہ ہندوستان میں علماء اور مشائخ کی خدمات اور ان کے خانوادوں کو بڑی قدر اور محبت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، وہ کسی بھی کام یا فرد کو اس کے تاریخی پس منظر میں دیکھتے تھے، اور اسی لحاظ سے اس کی قدر و قیمت کا تعین کرتے تھے، وہ خاندانی نجابت اور تاریخی تسلسل کے بڑے قدر دان تھے، وہ قوم وملت کی قیادت اداروں اور تنظیموں کی سربراہی کے لئے خاندانی افراد کو ترجیح دیتے تھے، ان کا شعور ویقین ہمیشہ اس نکتہ پر مرکوز رہتا تھا کہ نسل اور خون کے اثرات ہوتے ہیں اور اچھے خاندان کے افراد سے ہی بلند توقعات رکھی جاسکتی ہیں، باب سیاست کی مشہور حدیث "الأئمة من قريش" امامت وقیادت خاندان قریش میں رہے گی) اس میں اسی فطری حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

الأئمة من قريش صحيح لغيره وهذا إسناد قوي[5]

---

[5] - مسند الإمام أحمد بن حنبل الشيباني ج 4 ص 421 الناشر : مؤسسة قرطبة – القاهرة، سنن النسائي الكبرى لأحمد بن شعيب أبو عبد الرحمن النسائي ج 3ص467 الناشر : دار الكتب العلمية ، بيروت الطبعة الأولى ، 1411 – 1991.

اسی طرح ایک روایت کے الفاظ ہیں:

لاَیَزَالُ هَذَاالأَمْرُفِی قُرَیْشٍ مَابَقِیَ مِنَ النَّاسِ اثْنَانِ[6]

ترجمہ: یہ قیادت قریش کے لئے ہمیشہ رہے گی جب تک کہ دو آدمی بھی اس خاندان کے باقی ہوں۔

خاندانی لوگوں کے ساتھ ان کا برتاؤ

یہ بات ان کی زبان سے زیادہ ان کے عملی برتاؤ اور سلوک میں نظر آتی تھی ،میں نے بارہا تجربہ کیا کہ وہ ملک کے مشائخ اور بزرگوں کے خاندان کے ایک ایک فرد کا بے پناہ احترام کرتے تھے ،اپنے سے عمر اور علم و فضل میں بہت چھوٹے چھوٹے لوگوں کے ساتھ بھی ان کا رویہ انتہائی متواضعانہ ہوا کرتا تھا، مشہور علمی گھرانوں کی تو بات ہی کچھ اور ہے ،ہم جیسے گمنام علمی گھرانوں کے افراد کے ساتھ بھی ان کا معاملہ حیرت انگیز حد تک فراخ دلانہ تھا، مجھے بہار کے ایک ممتاز علمی اور روحانی خاندان کا فرد ہونے کی نسبت سے "اکثر "پیر جی" سے مخاطب فرمایا کرتے تھے ،اور کہتے تھے کہ ہندوستان دیوی دیوتاؤں کی سرزمین ہے ، یہاں جو مقام اور عزت واحترام پیروں کو مل سکتا ہے وہ کسی کے لئے ممکن نہیں ،خانوادۂ مشائخ سے نسبت کو وہ اللہ کی بڑی نعمت قرار دیتے تھے اور اس سے فائدہ اٹھانے پر بڑا زور دیتے تھے ،ایک مشہور علمی اور نقشبندی خانوادہ کے چشم و چراغ اور ممتاز عالم دین کے بارے میں کئی بار فرمایا کہ ان کو خانقاہی زندگی کی طاقت وافادیت میں نے بتائی، ورنہ وہ پہلے ادھر زیادہ رجحان نہ رکھتے تھے، تجربہ کے بعد وہ میری

---

[6] - صحیح مسلم ج 6 ص 2 حدیث نمبر 4807 الناشر : دار الجیل بیروت + دار الأفاق الجدیدة ــ بیروت

بصیرت کے قائل ہوگئے ،ان کو بھی مفتی صاحب "پیر جی "ہی کہا کرتے تھے،اور ان کا بے پناہ احترام بھی کرتے تھے۔۔۔یہی چیز ان کو بزرگوں کے آستانوں تک لے جاتی تھی ،پورے ملک کے اکابر علماء ومشائخ سے ان کا رابطہ تھا، ہر سال رمضان میں خانقاہ مونگیر اعتکاف کے لئے تشریف لے جاتے تھے۔

الٰہ آباد حضرت پرتابگڈھیؒ کی بارگاہ میں

میرے جد امجدؒ سے عقیدت کی بناپر منوروا شریف حاضری کی بھی ان کی خواہش تھی ،جب مجھے تلمذ کا موقعہ ملا،میں نے ان سے منوروا تشریف لے چلنے کی درخواست کی ،توبخوشی اس کے لئے راضی ہوگئے ،مگر اس کے ساتھ ہی ان کے دل کی ایک اور آرزو سامنے آگئی ،الٰہ آباد میں سلسلۂ نقشبندیہ کے ایک ممتاز صاحب نسبت بزرگ حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتابگڈھیؒ اپنی روحانیت اور قوت تاثیر کے لئے بے پناہ شہرت رکھتے تھے ،اور ان کی نسبت سے الٰہ آباد شہر پورے ملک کے لئے مرجع عام وخاص بناہوا تھا،مفتی صاحب کو ان کی ملاقات کا بھی بڑا اشتیاق تھا،میرے لئے بھی یہ بڑی سعادت کی بات تھی ،گوکہ میری ابتدائی تعلیم مدرسہ وصیۃ العلوم الٰہ آباد میں ہوئی تھی اور تقریباً دوسال (۱۳۹۹ھ تا ۱۴۰۰ھ مطابق ۱۹۷۹ء تا ۱۹۸۰ء) میں نے وہاں گذارے تھے ،لیکن ایک تو میری کمسنی اور لاشعوری کا وقت تھا،دوسرے میری طبیعت میں شروع سے ہی کم آمیزی حد سے زیادہ ہے ،علاوہ ازیں اس وقت تک حضرت پرتابگڈھیؒ کی شہرت کا آفتاب نصف النہار تک نہیں پہونچا تھا،یہی وجہ ہے کہ تقریباً دوسال کے پورے عرصہ میں ایک بار بھی میں نے حضرتؒ کا اسم گرامی کسی شخص کی

زبان سے نہیں سنا، آج یہ سعادت مجھے دیوبند سے الٰہ آباد واپس لا رہی تھی، نیز اپنی مادر علمی کی زیارت اور اپنے پرانے اساتذہ سے ملنے کا شوق بھی دامن گیر تھا۔۔۔ہم لوگ دیوبند سے میرٹھ پہونچے، میرٹھ میں سنگم اکسپریس پر سوار ہو کر دوسرے دن صبح نو دس بجے ہم لوگ الٰہ آباد پہونچ گئے ،رکشہ سے سیدھے حضرت پرتابگڈھیؒ کے آستانہ پر پہونچے، حضرت کا اپنا کوئی آشیانہ نہیں تھا، ان کا قیام ڈاکٹر ابرار احمد صاحب کے مکان پر تھا، ایک مکمل مسافرانہ زندگی، مؤمن کامل کا شاندار نمونہ، ڈاکٹر صاحب کے عالیشان مکان کا نچلا حصہ حضرت کے لئے مخصوص تھا، وہیں پر واردین وصادرین کے لئے بھی انتظام تھا، پہلے سے کوئی اطلاع نہیں تھی اچانک پہونچنے پر حضرت بے انتہا مسرور ہوئے ،مفتی صاحب ایک معروف شخصیت کے مالک تھے ،ان کی کتابیں علماء کے لئے حوالہ کا درجہ رکھتی ہیں ،الٰہ آباد کے اکثر علماء کی نگاہ سے مفتی صاحب کی کتابیں گذر چکی تھیں، خانقاہ میں آپ کی تشریف آوری سے مسرت کی لہر دوڑ گئی، حضرت سے ملاقات اور ہلکے پھکے ناشتہ کے بعد دوپہر کا کھانا حضرت شاہ وصی اللہ الٰہ آبادیؒ کے منجھلے داماد اور حضرت پرتابگڈھیؒ کے متوسل اور معتمد خاص، ممتاز عالم ربانی حضرت مولانا قمر الزماں صاحب الٰہ آبادی دامت برکاتہم کے یہاں ہوا مولانا الٰہ آبادی کا رویہ حضرت مفتی صاحب کے ساتھ بڑا نیاز مندانہ تھا، وہ بار بار اظہار نیاز مندی کے طور پر فرماتے تھے کہ حضرت ! میں نے اپنی فلاں کتاب میں آپ کی فلاں کتاب سے استفادہ کیا ہے، آپ تو میرے استاذ کے درجے میں ہیں۔

مدرسہ وصیۃ العلوم الٰہ آباد

دوپہر کے کھانے کے بعد ہم لوگ حضرت شاہ وصی اللہ صاحبؒ کی خانقاہ اور مدرسہ حاضر ہوئے، جہاں میں نے طالب علمی کے دوسال گذارے تھے، جو میری مادر علمی ہے اور جہاں میرے اساتذہ موجود تھے، وہاں پہونچ کر عہد طالب علمی کی تمام یادیں تازہ ہوگئیں، خانقاہ اور مدرسہ کی عمارتیں جوں کی توں تھیں، خانقاہ کی وہ کھپڑا پوش خام عمارت آج بھی اسی طرح بڑی سڑک کے کنارے کھڑی لوگوں کے لئے خاموش درس عبرت تھی جہاں میرے لڑکپن کے صبح وشام گذرے تھے، اس کے ایک ایک ذرہ سے پیار محسوس ہوا، میکدہ اسی طرح آباد تھا، ساقی بھی وہی تھے، البتہ پرانے میخوار جاچکے تھے، اس دور کی ساری صورتیں شیشۂ خیال پر تازہ ہوگئیں، نہ معلوم کس نے کدھر کی راہ لی؟ اور کون کس صحرا کا مسافر ہوا؟ دل میں ایک لہر سی پیدا ہوئی، کسی نے سرگوشی کی

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوان عشق
او بصحرا رفت ومادر کوچہار سو اشدیم

خانقاہ شاہ وصی اللہؒ کے مسند نشیں حضرت مولانا قاری محمد مبین صاحبؒ، حضرت مولانا محمد عرفان صاحبؒ اور کئی اساتذۂ کرام سے شرف نیاز حاصل ہوا، تمام حضرات نے حضرت مفتی صاحب کا خیر مقدم کیا اور ہم ان کی دعائیں اور محبتیں لیکر وہاں سے رخصت ہوئے۔

مدرسہ دینیہ غازی پور کی آغوش میں

سہ پہر میں ایک لوکل ٹرین الٰہ آباد سے غازی پور جاتی تھی، ہم لوگ اسی پر

سوار ہوئے ،اس زمانہ میں سفر کے لئے ریزرویشن وغیرہ کے تکلفات زیادہ نہیں تھے ، اتفاق سے ایک سنسان مقام پر ریل کا انجن فیل ہو گیا، بنارس سے دوسرا انجن منگوانے میں پورے پانچ گھنٹے لگے ،اس طرح ہم لوگ غازی پور شام کے بجائے شب کے تقریباً ایک بجے پہونچے ،اب اتنی گئی رات میں بلا علم واطلاع کہیں جانا مناسب محسوس نہ ہوا، لاچار ہم لوگوں نے اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں وقت گذارنا زیادہ آسان خیال کیا، صبح فجر کے بعد ہم مدرسہ دینیہ شوکت منزل حاضر ہوئے ،زندگی کے قیمتی ماہ وسال انہی درودیواروں کے سایے میں گذرے تھے ،میری زندگی کو زندگی بنانے میں ان کا بڑا حصہ ہے ، آج جو کچھ بھی میرے پاس ہے یہ خزانہ وہیں کا ہے ،ساری بہار اسی پود کا نتیجہ ہے جو وہاں کی آب وہوا میں لگائی گئی تھی، مجھے مدرسہ دینیہ کی اس عمارت سے بے پناہ محبت ہے ، آج بھی اس کا تصور کرتا ہوں ،اس احاطے میں بیٹے ہوئے دنوں کو یاد کرتا ہوں تو پورا وجود گمشدہ مسرتوں کے احساس سے سرشار ہو جاتا ہے ، آج وہ عمارت اپنی اصلی حالت میں موجود نہیں ہے ،اور نہ وہ کاروبار علم وہاں جاری ہے ،لیکن میری یادوں کی سرزمین پر وہ کھنڈرات ہمیشہ باقی رہیں گے اور ماضی کی یہ حویلیاں ہمیشہ مجھے مستقبل کی روشنی دیتی رہیں گی انشاء اللہ:

؎ دیکھ آکر میرے اجڑے ہوئے دل کی رونق
کیسی بستی تری یادوں کی بسا رکھی ہے

لیکن جن دنوں کا یہ قصہ ہے یہ عمارت جوں کی توں برقرار تھی، علم وفن کی بساط بھی بچھی ہوئی تھی، خمخانۂ محبت بھی اسی طرح جاری تھا، رندوں کی آمد ورفت بھی قائم تھی، گنگا کی لہریں ہر روز اٹھ کر اس عمارت کی عظمتوں کو سلام کرتی تھیں، قدسیوں

کا ایک پورا قافلہ وہاں قیام پذیر تھا، وہاں موجود لوگوں میں حضرت مولانا صفی الرحمن صاحب، حضرت مولانا مختار احمد صاحب اساتذۂ درجۂ عربی اور جناب مولانا قاری شبیر احمد صاحب استاذ درجۂ حفظ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، یہ حضرات ہماری اچانک آمد پر بے انتہا مسرور ہوئے، بالخصوص حضرت مفتی صاحبؒ کی تشریف آوری اس ادارہ کے لئے نعمت غیر مترقبہ تھی، مدرسہ میں ایک جشن کا ماحول بن گیا، غالباً امتحان سالانہ کی تیاریاں چل رہی تھیں اس لئے کوئی اجتماعی پروگرام نہیں ہو سکا، باقی ہر لحاظ سے مفتی صاحب سے استفادہ کیا گیا۔

منورواشریف—پہلی آمد

یہاں سے فارغ ہو کر ہم لوگ منورواشریف کے لئے روانہ ہوئے، راستے کی دشواریوں کا مقابلہ کرتے ہوئے ہم لوگ ۲۷ /رجب المرجب ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۶ /مارچ ۱۹۸۸ء بدھ کی شام منورواشریف حاضر ہوئے، حضرت مفتی صاحب کی یہ پہلی تشریف آوری تھی، اس لئے ان پر خاص کیفیت چھائی ہوئی تھی، وہ ہمارے یہاں کے خانقاہی معمولات میں پورے انہماک کے ساتھ شریک رہے، میرے والد ماجد حضرت مولانا محفوظ الرحمن صاحب بھی بہت مسرور تھے، والد صاحب سے مفتی صاحب کی پہلی ملاقات تھی، لیکن افراد خانہ کی طرح ملے، جد امجدؒ حضرت مولانا سید احمد حسن منورویؒ اور جد اکبر حضرت مولانا عبد الشکور آہ مظفر پوریؒ سے اپنی ملاقات اور انتساب کا تذکرہ کیا، حضرت مولانا عبد الشکورؒ سے تو عہد طالب علمی میں پٹنہ مدرسہ شمس الہدیٰ میں ان کی ملاقات ہوئی تھی، مفتی صاحب کے استاذ حضرت مولانا عبد الرحمن صاحبؒ امیر شریعت

خامس بہارواڑیسہ حضرت مولانا عبدالشکور آہؔ مظفر پوری کے تلمیذ رشید تھے ، مفتی صاحب امتحان دینے کے لئے مدرسہ شمس الہدیٰ پہونچے تووہاں ان کی ملاقات حضرت آہؔ سے ہوئی تھی ، حضرت مولانا عبدالرحمن کی نسبت سے حضرت آہؔ نے بڑی شفقت کا معاملہ فرمایا تھا۔

حضرت منورویؒ سے ان کی ملاقات مونگیر جاتے ہوئے ٹرین میں ہوئی تھی ، جس کا مختصر تذکرہ پہلے آچکا ہے ، مفتی صاحب نے والد صاحب سے فرمایا کہ حضرت منورویؒ سے میں نے اپنی ایک باطنی کمی کا بھی تذکرہ کیا تھا ، حضرت نے ایک وظیفہ بتایا ، اس کے پڑھتے ہی اسی آن میرا قلب ذاکر ہو گیا ، اور وہ بیماری جاتی رہی۔

منوروا شریف کے ایک قدیم فاضل دیوبند جناب مولانا عبدالحق صاحب (ریٹائرڈ شعبۂ ہند فوج) نے والد صاحب سے بیان کیا کہ میں اپنی عہد طالب علمی میں اکثر مفتی صاحب سے ملنے جاتا تھا ، بارہا میں نے دیکھا کہ وہ حضرت منورویؒ کے شجرہ والی کتاب سامنے رکھ کر محو دعا ہیں ، یہ ۱۹۶۵ء یا ۱۹۶۶ء کی بات ہے۔

اس کے بعد مفتی صاحب بارہا میرے گھر تشریف لائے ، اور ہر تشریف آوری پر میری کیفیت اس شعر کی عکاس رہی:

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

میری شادی (اپریل ۱۹۹۳ء) میں تشریف لائے ، لادھ کپسیا (ضلع سمستی پور) تشریف لے گئے ، نکاح پڑھایا ، شب میں وہیں قیام فرمایا ، دوسرے دن شام میں مہمانوں کے ساتھ واپس تشریف لائے ، وغیرہ۔۔۔ان کی ان عنایات کا خیال کرتا ہوں تو میرا

رواں رواں جذبات تشکر سے سرشار ہو جاتا ہے، جامعہ ربانی کے قیام کے عمل سے ان کو میں کافی دلچسپی رہی، شہر سمستی پور میں میری تحریک کی شکست پر کافی رنجیدہ تھے اور چاہتے تھے کہ ضرور اس کی تلافی کی کوئی صورت پیدا ہو جائے، میں بھی بہت دل شکستہ تھا ،انہوں نے میرا حوصلہ بڑھایا اور مسلسل خطوط کے ذریعہ مجھے دوبارہ مدرسہ کے قیام کے لئے آمادہ فرمایا، نام اور مقام کی تجویز میں شرکت فرمائی، مدرسہ کے قیام کے بعد اس کے کئی سالانہ جلسوں میں شریک ہوئے ، مدرسہ کی نئی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا، مدرسہ کی رفتار ترقی سے وہ مطمئن ہی نہیں قادر مطلق کی کارسازی پر حیران بھی تھے، انہوں نے اپنی زندگی میں ہی مدرسہ کی شاندار عمارت دیکھی اور سمستی پور کے لٹے پٹے قافلے کو نئے عزم وحوصلہ کے ساتھ محو سفر دیکھ کر اللہ پاک کا شکر ادا کیا۔

قافلہ سالار کی آخری وصیت

آخری بار وہ جامعہ کے ایک اجلاس میں تشریف لائے ،وہ تقریر ان کی آخری تقریر تھی، اس میں انہوں نے گویا اپنا قلب وجگر نکال کر رکھ دیا، نہ کوئی جوش وخروش تھا، نہ کوئی نعرۂ انقلاب ، ایک خاموش دریا تھا جو بہہ رہا تھا، اس خطاب میں انہوں نے میرے خاندان سے اپنے تعلقات کی تاریخ پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور فرمایا کہ:

"میرا تعلق اس خاندان سے مسلسل چار پشتوں سے ہے، اور اپنے تجربات ومشاہدات کی روشنی میں میری شہادت یہ ہے کہ اس خاندان نے ہمیشہ دین کی سربلندی اور قوم وملت کی فلاح کے لئے کام کیا ہے، یہ اللہ والوں کی ایک جماعت ہے جو اس علاقہ میں خیمہ زن ہے، یہ قدسیوں کا قافلہ

ہے جو اس سرزمین پر پڑاؤ ڈالے ہوا ہے، یہ نور الٰہی کا نیر تاباں ہے جس سے پورے بہار میں روشنی پھیل رہی ہے، اس چراغ سے کتنے چراغ روشن ہوئے، کتنے دلوں نے زندگی پائی، یہ وہ شہاب ثاقب نہیں جو ٹوٹ کر گم ہو جائے، بلکہ ایک جگمگاتا ہوا نور ہے، جو تسلسل کے ساتھ اپنا کام کر رہا ہے، میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ اس نور کی کرنوں نے پورے آفاق کو اپنے گھیرے میں لے لیا ہے۔"[7]

ان کی تقریر سے صاف طور پر محسوس ہوتا تھا کہ یہ اڑ جانے والا پرندہ ہے ،اور یہ الوداعی خطاب ہے، یہ تقریر سے زیادہ ایک قافلہ سالار کی اپنی قوم کے نام آخری وصیت ہے۔

مفتی صاحب کا یہ آخری سفر تھا، اس کے بعد مفتی صاحب دیوبند سے ریٹائرڈ ہو کر مستقل اپنے گاؤں پورا ضلع دربھنگہ میں رہنے لگے ،بظاہر بہت قریب آ گئے لیکن جسم وجان کی معذوری نے ان کو کہیں جانے کی اجازت نہیں دی، ایک بار میں نے اور ایک بار والد صاحب نے ان کے گاؤں جاکر عیادت کی، پھر اس مسافر آخرت نے ہمیشہ کے لئے اپنی آنکھیں موند لیں،انا للہ وانا الیہ راجعون ۔

جامعہ ربانی سے ان کو بے پناہ تعلق تھا، وہ اس کو اپنا ادارہ سمجھتے تھے اور اس کی ترقیات سے بے حد خوش ہوتے تھے ،اس کا اندازہ ان کے ان پیغامات سے ہوتا ہے جو مختلف مواقع پر انہوں نے قوم کے نام اس ادارہ کے لئے جاری فرمائے ہیں۔

---

[7] ۔ مفتی صاحب کی تقریر سے ایک اقتباس، خلاصہ

مجھ سے بھی ٹوٹ کر محبت فرماتے تھے، میری تحریرات اور کاموں میں وہ اپنا عکس جمیل دیکھتے تھے، ایک بار والد صاحب ان کی عیادت کے لئے ان کے گاؤں تشریف لے گئے، اس وقت تک ان کی شناخت ختم ہو چکی تھی، صرف یاد داشت کام کر رہی تھی، میرا نام لیکر بڑی حسرت کے ساتھ فرمایا'اب تو ہم چلے، اوران عزیزوں کو چھوڑ کر چلے، اب تو میں کسی لائق نہیں رہا، انہی کے کاموں کو اپنا کام سمجھتا ہوں"

مشاہدات سفر

☆ مجھے مفتی صاحب کے ساتھ کئی بار سفر کا موقعہ ملا، اور بحیثیت خادم مجھے یہ سعادت حاصل ہوئی اور ہر سفر میں میں نے محسوس کیا کہ جہاں ایک طرف وہ اہل علم اور اصحاب رشد سے بے پناہ عقیدت و محبت رکھتے تھے، وہیں ان کی کوشش ہوتی تھی کہ اچھے گھرانوں کے افراد اپنے اندر احساس و اہلیت پیدا کریں اور اپنے خاندانی روایات کا پاس ولحاظ رکھیں، وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ مصاف زندگی میں نسبتاً یہ لوگ زیادہ ابھر کر سامنے آئیں، اس ضمن میں دو واقعات کی طرف اشارہ کرنا مناسب سمجھتا ہوں، جن کا میں خود عینی شاہد ہوں:

لکھنؤ کا سفر

(الف) لکھنؤ کا پہلا سفر میں نے مفتی صاحب کے ساتھ کیا، لکھنؤ میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی شہرۂ آفاق کتاب "المرتضیٰ (اردو)" کے رسم اجراء کی تقریب تھی، پورے ملک سے منتخب اصحاب علم و تحقیق اس میں شرکت کر رہے تھے، حضرت مفتی صاحب بھی اس میں مدعو تھے، مجھے اپنے رفیق سفر اور خادم کی

حیثیت سے شامل فرمایا، دیوبند سے ہم لوگ میرٹھ پہونچے وہاں سے نوچندی اکسپریس کے ذریعہ صبح سویرے لکھنؤ اسٹیشن پہونچ گئے ،اسٹیشن پر کارکنان استقبال کے لئے موجود تھے ،ہمیں وہاں سے گلمرگ ہوٹل لے جایا گیا، ہمارے قیام کا انتظام وہیں تھا، ضروریات سے فارغ ہو کر تھوڑی دیر ہم لوگوں نے آرام کیا، شام کے وقت ہم لوگ دارالعلوم ندوۃ العلماء حاضر ہوئے ،حضرت امیر شریعت رابع مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ اپنے صاحبزادۂ محترم حضرت مولانا محمد ولی رحمانیؒ کے ہمراہ ندوہ کے مہمان خانے میں قیام فرماتھے ،مفتی صاحب نے اسی میں راحت محسوس کی اپنے بزرگوں کے سایۂ شفقت میں رہیں، اس طرح اس حقیر کو بھی پہلی بار ان بزرگوں کے قریب رہنے کا شرف حاصل ہوا ،حضرت مولانا علی میاںؒ کے پاؤں میں سخت تکلیف تھی ،مفتی صاحب ان کے یگگونہ شاگردوں میں تھے ،لیکن ان کی شفقت وتواضع کہ جب مفتی صاحب ملاقات کے لئے حاضر ہوئے ،انہوں نے سخت تکلیف کے باوجود کھڑے ہونے کی کوشش فرمائی ،لیکن مفتی صاحب کے بے حد اصرار پر توقف فرمایا ، صبح کا ناشتہ حضرت کے دستر خوان پر کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ،ہمارے علاوہ دو تین حضرات اور بھی موجود تھے ،مختلف علمی اور تاریخی موضوعات پر حضرت ندویؒ گفتگو فرماتے رہے ،حضرت کی شخصیت کو پہلی بار اتنے قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا تھا ،میں بہت زیادہ متاثر ہوا ،یہ تو ان کا خاص دستر خوان تھا، عمومی دستر خوانوں پر بھی حضرت پابندی کے ساتھ شرکت فرماتے تھے ، المرتضیٰ کی رسم اجراء حضرت امیر شریعتؒ کے ہاتھوں انجام دی گئی ،علماء اور اہل دانش کا بڑا قابل قدر مجمع تھا، اہل سیاست اور ارباب صحافت بھی بڑی تعداد میں موجود تھے ،میں نے زندگی میں پہلی بار اتنا وقیع اجتماع دیکھا جس میں بیک وقت پورے ملک کی نمائندہ

شخصیات موجود تھیں ،۔۔۔۔دوسرے دن ہم لوگ مہمان خانہ میں حضرت امیر شریعت کی قیام گاہ پر موجو تھے ایک فقہی مسئلہ زیر بحث تھا، حضرت مولانا محمد ولی رحمانیؒ صاحب کھل کر گفتگو فرمارہے تھے ،ان کی رائے دیگر شرکائے مجلس سے الگ تھی، آخر حضرت امیر شریعتؒ کی فیصلہ کن گفتگو پر بحث اختتام پذیر ہوئی،اس طرح دونوں ہی قران السعدین کی مجالس میں حاضری کا مجھے موقعہ ملا،اور دونوں ہی جگہ علم ودین اور فکر امت کے سوا کچھ نظر نہ آیا اور دونوں ہی مقامات پر مفتی صاحب سراپا ادب بنے رہے، بہت کم گفتگو میں حصہ لیا،اسی طرح مفتی صاحب نے اس حقیر کو بھی کہیں فراموش نہیں کیا،بزرگوں سے تعارف کرایا۔

حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے آستانہ پر

اس اہم ترین تقریب میں لکھنؤ کی ایک بڑی علمی شخصیت شریک نہیں ہو سکی تھی،وہ تھے حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحبؒ، مفتی صاحب کو ان سے بھی ملنا تھا،وہ ملک کے قد آور علمی ودینی شخصیت کے حامل ہونے کے ساتھ ایک بڑے علمی رسالہ کے مدیر بھی تھے، مفتی صاحب کو ان کے ساتھ ایک خصوصیت یہ بھی حاصل تھی کہ حضرت نعمانیؒ محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمیؒ کے تلامذہ میں تھے ،اور حضرت اعظمی مفتی صاحب کے بھی خاص استاذ تھے ۔۔۔۔۔ہم لوگ عصر کی نماز کے بعد حضرت نعمانیؒ کے آستانہ پر حاضر ہوئے ،وہ کئی سال سے صاحب فراش اور اٹھنے بیٹھنے سے معذور تھے، ہم لوگ حویلی کے اندر جاکر ملے اور بھی کئی مشتاقان زیارت منتظر تھے، تمام ہی حضرات کو ملاقات وزیارت کا شرف حاصل ہوا، حضرت کے حجرہ میں سب لوگوں نے

اپنی اپنی نشست سنبھال لی، میرے لئے کوئی جگہ خالی نہیں بچی، حضرت نے اپنی چارپائی پر بیٹھنے کو فرمایا، مجھے تھوڑا تامل ہوا، لیکن حضرت کے حکم پر میں آپ کے پائتانے میں بیٹھ گیا ،دم کی چائے آئی، میں ہی سب سے خورد تھا، مجھے چائے بنانے کا حکم ملا، مجھے کوئی خاص سلیقہ نہیں تھا، لیکن پھر بھی میں نے حکم کی تعمیل کی، تمام شرکاء کو چائے پہونچائی گئی ،حضرت کے سامنے بھی چائے پیش کی گئی، حضرت نے تھوڑا نوش فرما کر میری طرف بڑھا دیا، میں نے بڑے فخر اور احساس شرف کے ساتھ حضرت کی متروکہ چائے نوش کی، اس طرح لکھنؤ کے اس سفر میں مفتی صاحب کی برکت سے بڑے اکابر کی صحبت و قرب کی دولت بے بہا مجھے حاصل ہوئی۔

؎ وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم ولیکن مدتے باگل نششتم

واپسی کے وقت حضرت مفتی صاحب کے تلمیذ رشید حضرت مولانا سعید الرحمن الاعظمی موجودہ مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ ریلوے اسٹیشن تک الوداع کہنے کے لئے آئے، مولانا اعظمی کو پہلی بار میں نے اسی موقعہ پر دیکھا، اس سفر میں جہاں میں نے مفتی صاحب سے بزرگوں کا ادب واحترام، بڑوں کی مجلس میں شرکت کے آداب سیکھے ،وہیں میں نے صاف طور پر محسوس کیا کہ وہ کس طرح چھوٹوں کو بزرگوں سے روشناش کراتے اور بڑی جگہوں کے طور وطریق سے واقف کراتے تھے۔

؎ خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

سفر دہلی برائے فقہی سیمینار

☆اس ضمن میں دوسرا یادگار تجربہ سفر دہلی کا ہے، فقیہ الاسلام حضرت مولانا

قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ نے جب اسلامک فقہ اکیڈمی کی بنیاد ڈالی، تو جن چند ممتاز علماء کی سربراہی میں اکیڈمی نے اپنا سفر شروع کیا، ان میں حضرت مفتی صاحب کی شخصیت سرفہرست تھی، اکیڈمی کا پہلا سیمینار بڑی شان کے ساتھ ہوا، دوسرے سیمینار کا سوالنامہ آیا تو مفتی صاحب نے اس کا ایک حصہ (کرنسی نوٹ سے متعلق) مجھے مرحمت فرمایا اور اس پر تحقیق کرنے کا حکم دیا، میرے لئے گو یہ بالکل نامانوس موضوع تھا، لیکن بزرگوں کے فیض صحبت کے نتیجہ میں میں نے بآسانی پندرہ دن میں اس پر اپنی تحقیق مکمل کرلی، مفتی صاحب بہت خوش ہوئے، بہت حوصلہ افزائی فرمائی، دراصل سوالنامہ کا دوسرا حصہ انہوں نے میرے ایک دوسرے ساتھی کے حوالہ فرمایا تھا، انہوں نے بہت زیادہ دلچسپی اور محنت کا مظاہرہ نہیں کیا، جس سے ان کو مایوسی ہوئی تھی،۔۔۔۔ مفتی صاحب کی حوصلہ افزائی سے میرے بال وپر کو پرواز ملی، میں نے اپنے تیار کردہ مقالہ کی ایک کاپی خاموشی کے ساتھ فقہ اکیڈمی کے دفتر بھیج دی، مفتی صاحب کو بھی محض اس احساس کے تحت اس کی اطلاع نہیں دی کہ میں کیا اور میرا مقالہ کیا؟ اس زمانہ میں یہ استحقاق صرف اکابر محققین کے لئے خاص تھا کہ وہ کسی مسئلہ پر اپنی رائے یا تحقیق پیش کریں، آج کی طرح قلمی یا فکری بحران کا دور نہیں تھا اور نہ ہر بوالہوس کو یہ اجازت حاصل تھی کہ اپنے خیالات پریشاں کو مقالہ یا تحقیق کا نام دے، اس زمانہ میں کسی نو آموز کا کسی سنجیدہ علمی موضوع پر طبع آزمائی بہت ہی غیر معمولی بات تصور کی جاتی تھی، یہی وہ احساس تھا جس نے مجھے اپنے شفیق ترین استاذ کے سامنے بھی اس تعلق سے کوئی حرف تمنا زبان پر لانے کی اجازت نہیں دی،۔۔۔۔ آخر سیمینار کی تاریخ قریب آگئی، دیوبند کے متعدد علماء اس میں شرکت کے لئے تیاریوں میں مصروف تھے، مفتی صاحب کے خادم کی حیثیت سے

قرعۂ فال ایک بار پھر میرے نام نکلا، مفتی صاحب نے بڑے اصرار کے ساتھ اس میں شرکت کرنے کا حکم دیا، خواہش تو میری بھی تھی، مفتی صاحب کے حکم سے میری آرزؤں کے پر لگ گئے، میرے ایک ساتھی جناب مولانا مفتی محمد ارشد صاحب قاسمی[8] بھی مفتی صاحب کی ہم رکابی میں شامل ہوئے، اس طرح ہم تین آدمیوں کا قافلہ دیوبند سے دہلی کی طرف روانہ ہوا، چند گھنٹوں کے بعد ہم دہلی میں تھے، دسمبر کی کڑکڑاتی ہوئی سردی، دہلی کا یخ بستہ موسم، فضا میں دھند چھائی ہوئی، اس پر انتہائی سرد ہوائیں، سیمینار کے تمام شرکاء گرم شیروانیوں اور گرم ملبوسات سے آراستہ تھے، میرے ہم درس مفتی ارشد صاحب بھی شیروانی زیب تن کئے ہوئے تھے، بس ایک یہ تنہا فقیر اپنی پرانی چادر بدن میں لپیٹے سردیوں سے جنگ لڑنے کی کوشش کر رہا تھا، فائیو اسٹار کلچر کے ماحول میں آفاقی علماء اور دانشوروں کے درمیان اپنے لباس فقر پر کبھی خفت کا احساس بھی ہوتا تھا، لیکن پھر یہی خیال باعث تسلی بنتا کہ میں کیا اور میری حقیقت کیا؟

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ سے میری پہلی ملاقات

اس سیمینار کے روح رواں اور قافلہ سالار حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی زیارت کا پہلی بار شرف حاصل ہوا، وہ مہمانوں کے استقبال کے لئے جان و دل بچھائے ہوئے بہت مصروف تھے، ان مصروف لمحات میں مفتی صاحب کے دو جملوں نے

---

[8] ۔مظفر نگر یوپی کے رہنے والے ہیں، دورۂ حدیث اور افتاء میں ہم لوگ ایک ساتھ رہے، بعد میں یہ معین المفتی ہوئے اور میں معین المدرس، معین المفتی کی مدت مکمل کرنے کے بعد جلال آباد مدرسہ سے ایک عرصہ تک بحیثیت مفتی اور مدرس وابستہ رہے، حضرت مولانا مسیح اللہ جلال آبادیؒ سے بیعت ہوئے، حضرت کے وصال کے بعد حضرت مولانا ابرار الحق ہردوئیؒ سے تجدید بیعت کی اور پھر حضرت کے مجاز ہوئے، اب اپنے گاؤں بجھیڑی ضلع مظفر نگر یوپی میں خود ایک مدرسہ اور خانقاہ کے مہتمم اور مسند نشین ہیں۔

تعارف کا کام کیا، بظاہر کوئی خاص توجہ نہیں فرمائی، لیکن بعد کے واقعات سے ظاہر ہوا کہ میرا نام ان کے ذہن میں تھا اور ملاقات کے بعد میری صورت بھی ان کے لوح دماغ پر نقش کالحجر ہو گئی،۔۔۔۔۔وقفۂ چائے میں جب میں نے اور مفتی ارشد صاحب نے قاضی صاحب سے ملاقات کی تو بہت محبت سے ملے اور کاؤنٹر پر جا کر ہمیں یہ کہہ کر سیمیناری فائلیں دلوائیں اور ہمارے ناموں پر اپنی مہر تصدیق ثبت فرمائی کہ بعد میں یہی بچے تو کام کریں گے ،۔۔۔۔۔میرا مقالہ دیگر حضرات کے مقالات کی طرح شرکاء کے درمیان تقسیم کیا گیا، مفتی صاحب کے سامنے جب میرا مقالہ آیا تو انہیں حیران کن مسرت ہوئی، قیامگاہ پر فرمایا پہلے سے کیوں نہ بتایا ؟میں مقالہ کی خواندگی کرواتا، مگر میرے خواب وخیال میں یہ کہاں تھا کہ میری تحریر بھی کسی لائق ہو گی، اکیڈمی کی طرف سے کرنسی نوٹ کا جب مجلہ شائع ہوا تو وہ مقالہ قاضی صاحبؒ نے من وعن شامل فرمایا، یہ میرا پہلا فقہی مقالہ تھا، جو شائع ہوا۔۔۔۔دہلی سے واپسی کے وقت دیگر مندوبین کی طرح بلا طلب مجھے بھی اخراجات سفر پیش کئے گئے، جب کہ میں مدعو کی حیثیت سے شریک نہیں تھا۔۔۔۔ظاہر ہے کہ ان تمام ثمرات کا سرچشمہ حضرت مفتی صاحب ہی کی ذات گرامی تھی۔ ؎ وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

مفتی صاحبؒ کی اولیات

☆مفتی صاحب کی دوسری اہم خصوصیت جو ان کو اپنے ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ انہوں نے اپنے عمل کے لئے ہمیشہ ان میدانوں کو چنا جو دوسروں کے

لئے مشکل تھا یا چھوڑ دیا گیا تھا، اس بنا پر اس کو ہم مفتی صاحب کی اولیات کا نام دے سکتے ہیں، ہم اس ضمن میں بطور مثال چند چیزوں کا ذکر کرتے ہیں:

مساجد کو ایک نظام اور فلسفہ کے طور پر پیش کیا

(۱) مفتی صاحب نے دیوبند آنے سے قبل سانہہ (مونگیر) کے قیام کے زمانہ میں مساجد کے موضوع پر ایک اچھوتا کام کیا اور اس کو ایک مستقل نظام اور فلسفہ کی صورت میں پیش کیا، اس سے پہلے مساجد کا اس نقطۂ نظر سے کسی نے مطالعہ نہیں کیا تھا ، گو یہ فکر ان کو علامہ گیلانیؒ سے ملی تھی، لیکن کام مفتی صاحب نے کیا اور ایسا کیا کہ اس کا کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا، "اسلام کا نظام مساجد" کے نام سے مفتی صاحب کی یہ قلمی کاوش شائع ہوئی ، یہ مفتی صاحب کی شہرۂ آفاق کتاب ہے ،بڑی مقبولیت حاصل ہوئی ، دنیا کے مختلف اداروں نے اسے شائع کیا۔

اس کے علاوہ مساجد کی تاریخی حیثیت پر بھی مفتی صاحب نے ایک بڑا قابل قدر کام کیا 'تاریخ مساجد "مگر وسائل کی قلت کے سبب مفتی صاحب اس کو اس طرح تیار نہیں کر سکے جیسا وہ کرنا چاہتے تھے ،اس کے لئے اسفار کی ضرورت تھی ،وہ تصاویر بھی شامل کرنا چاہتے تھے، لیکن مفتی صاحب نے جس دور میں یہ کام کیا وہ بے سروسامانی کا دور تھا، ذرائع ابلاغ وترسیل بھی اس قدر ترقی یافتہ نہ تھے ، لیکن آج کے دور میں مفتی صاحب کی منشا کے مطابق وہ کتاب تیار کی جاسکتی ہے۔

کتب خانہ کو مستقل فن کی حیثیت سے روشناش کیا

(۲) اسی طرح کتب خانہ کے موضوع پر مفتی صاحب نے جو کام کئے، ممکن ہے

عربی زبان کے لئے ان میں کوئی جدت نہ ہو ،لیکن یورپ نے آج جس طرح اس کو مستقل فن کی صورت دی ہے ،ہمارے یہاں اردو زبان میں اس کا کوئی تصور نہیں تھا، مفتی صاحب نے اپنی تحریروں کے ذریعہ اس کو مستقل فن کی حیثیت سے روشناش کیا، اس موضوع پر مفتی صاحب کی ایک تحریر قیام سانہہ کے دور کی ہے جو انہوں نے کتب خانہ جامعہ رحمانی کے افتتاح کے موقعہ پر لکھی تھی ،اور وہی تحریر ان کے دیوبند آنے کا سبب بنی۔

دوسری تحریر ان کی مخطوطات کے نام سے دوجلدوں میں ہے ،یہ کتاب دارالعلوم کی لائبریری کے لئے لکھی گئی تھی، مفتی صاحب کا یہ ایک اہم ترین کارنامہ ہے، جو کم ازکم دارالعلوم کی تاریخ میں ایک نئی پیش رفت تھی اور اس کام کو وہی شخص انجام دے سکتا ہے، جس میں کتابی علوم کے ساتھ اجتہاد و تحقیق کی بھی صلاحیت ہو، جو علم کے ساتھ قلم کے میدان کا بھی شہسوار ہو ،جو جرأت رندانہ کے ساتھ بصیرت شاہانہ بھی رکھتا ہو ،ظاہر ہے کہ مفتی صاحب میں یہ تمام خصوصیات موجود تھیں ،جن کی بناپر اس وقت کے ارباب انتظام کی نظر انتخاب آپ پر پڑی اور آپ نے اپنے بزرگوں کے اعتماد کو وقار بخشا۔

کتب خانۂ دارالعلوم دیوبند کو فنی بنیادوں پر مرتب کیا

(۳)کتب خانۂ دارالعلوم کی ترتیب وتنسیق کا عمل بھی یقیناً مفتی صاحب کی اولیات ہی میں شمار کیا جائے گا، مفتی صاحب کی آمد سے قبل دارالعلوم میں کتب خانہ موجود تھااور اس میں نادر ونایاب کتابوں کا بڑا ذخیرہ بھی موجود تھا، لیکن لائبریری کی

ایسی فنی ترتیب جس سے کتابوں کا تحفظ اور استفادہ سہل اور مستحکم ہوتا ہے موجود نہیں تھی، مفتی صاحب نے ملک کی مختلف لائبریریوں کے طریق کار کا معائنہ کیا، باقاعدہ اس کے لئے اسفار کئے اور پھر دارالعلوم کے کتب خانہ کو نئی فنی ترتیب پر استوار کیا، مفتی صاحب کے بعد بھی کتب خانہ کی ترقیات وتوسیعات کا سلسلہ جاری ہے اور ماشاء اللہ اس میں کافی تنوع پیدا ہوا ہے، لیکن ان سب کی اساس مفتی صاحب کی اسی ابتدائی فنی ترتیب پر ہے، جس سے کتب خانہ کبھی بے نیاز نہیں ہوسکتا اور نہ کتب خانہ کی تاریخ میں مفتی صاحب جیسے اولین معماروں کو فراموش کیا جاسکتا ہے۔

بعد میں دارالعلوم ندوۃ العلماء نے بھی اپنی لائبریری کی تنظیم کے لئے مفتی صاحب کی خدمات سے فائدہ اٹھایا، بعد میں ندوہ سے وہ چیز شائع ہوئی، لیکن اس پر مفتی صاحب کا نام موجود نہیں تھا، اس طرح ارباب ندوہ نے مفتی صاحب کے لئے اعتراف خدمت کا وہ حق ادا نہیں کیا جو ان کو کرنا چاہئے تھا۔

ترتیب فتاویٰ کا عظیم الشان کام

(۴) یہی حال دارالعلوم کے دارالافتاء کا بھی تھا، کہ فتاویٰ کا بے پناہ ذخیرہ وہاں موجود تھا، حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے اس کی ایک دو جلدیں مرتب کی تھیں اس کے بعد عرصہ ہوا یہ سلسلہ موقوف ہو چکا تھا، ضرورت تھی کہ ترتیب فتاویٰ کا مستقل شعبہ قائم کیا جائے، جہاں باقاعدہ ترتیب فتاویٰ کا کام انجام دیا جائے، حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند کی خداداد بصیرت اور حسن انتظام نے اس شعبہ کو وجود بخشا، اور اس کے اولین خادم کی حیثیت سے مفتی صاحب کو وہاں

مقرر کیا گیا، مفتی صاحب نے دہائیوں پر محیط بکھرے ہوئے فتاویٰ کے سمندر میں غواصی کرکے ان کو موضوعاتی طور پر مرتب کرنے اور حوالہ جات اور تعلیقات کے ساتھ مزین کرنے کا کام شروع کیا، کام اتنے سلیقہ اور فقیہانہ بصیرت کے ساتھ شروع کیا گیا کہ اس کی پہلی جلد منظر عام پر آتے ہی علمی دنیا میں مفتی صاحب کے نام کی دھوم مچ گئی، اس پر مفتی صاحب کا جاندار اور مفصل مقدمہ فقہ وفتاویٰ کے اصول ومقدمات کے باب میں مستقل رہنما کتاب کی حیثیت رکھتا ہے، حضرت مہتمم صاحبؒ کے پاس ہر طرف سے تحسین و آفریں کے پیامات موصول ہوئے، مفتی صاحب کا حوصلہ بلند ہوا، پھر اس کی مسلسل کئی جلدیں آگئیں، پورے ملک میں مفتی صاحب کی شہرت "مرتب فتاویٰ دارالعلوم" کی حیثیت سے ہوگئی، اس کی بارہ (۱۲) جلدیں آئی تھیں، کہ دارالعلوم کے حالات بدل گئے، نئی جماعت اور نئی انتظامیہ نے کام سنبھالا، کام کو سمجھنے میں اس کو کئی سال لگے، ادھر مفتی صاحب کے قویٰ کمزور ہوگئے، ناموافق حالات اور پیہم صدمات وحادثات نے ان کو دل شکستہ کردیا تھا، پھر بھی ترتیب کا کام وہ بخوبی کرسکتے تھے، چنانچہ میں نے اپنے عہد طالب علمی میں ان کو ترتیب کا کام کرتے ہوئے دیکھا تھا، بلکہ عملی طور پر میں نے بھی اس میں شرکت کی تھی، لیکن پتہ نہیں کیوں ایسے کہنہ مشق اور بصیرت مند فقیہ سے استفادہ کرنے کے بجائے ان سے محرومی کو گوارا کیا گیا، یہ بھی خبر نہیں کہ ان کی مرتب کردہ تیرھویں جلد کیا ہوئی؟۔۔۔۔۔۔دارالعلوم سے فتاویٰ کی تیرھویں جلد شائع ہوئی لیکن اس پر مفتی صاحب کا نام موجود نہیں تھا،۔۔۔۔حالانکہ ضعف اور بڑھاپے کی وجہ سے اگر فی الواقع کام میں کچھ کمی بھی رہ گئی ہو تو بھی ایک قدیم خدمتگار اور بزرگ عالم وفقیہ ہونے کے ناطے ان کا نام بھی اس پر ہونا چاہئے تھا، اس سے خود اس

کتاب کی اہمیت دوچند ہوتی اس لئے کہ فقہی موضوعات پر مفتی صاحب نے جتنا لکھا ہے اور بصیرت وآگہی کی روشنائی میں ڈبو کر لکھا ہے کہ معاصر علماء میں شاید ہی کوئی اور نام پیش کیا جاسکے۔

فرق باطلہ کی سرکوبی اوراس کے لئے رجال کار کی تیاری

دارالعلوم کی تاریخ میں ایک نئی پیش رفت

(۵)مفتی صاحب جب دارالعلوم دیوبند تشریف لائے ،تو آپ نے اپنے کام کا آغاز فرق باطلہ کے رد سے کیا،اس وقت تک دارالعلوم میں فرق باطلہ کے رد کے لئے کوئی باقاعدہ شعبہ موجود نہیں تھا،مفتی صاحب کے ذریعہ اس اہم ترین شعبہ کا آغاز ہوا،۔۔۔۔۔۔۔اسی طرح شعبۂ علوم قرآن کا آغاز بھی مفتی صاحب کے ذریعہ ہوا،۔۔۔۔۔۔۔اور سب سے اہم بات یہ کہ اہل قلم افراد کی ٹیم تیار کرنے اور مختلف میدانوں کے لئے افراد سازی کے جس مبارک عمل کا آغاز مفتی صاحب کے ذریعہ ہوا وہ مفتی صاحب کا ایک خاص امتیاز ہے اور جس کو بلاشبہ مفتی صاحب کی اولیات میں شمار کیا جاسکتا ہے،اس شعبہ سے بعض ایسی نابغۂ روزگار شخصیتیں تیار ہوئیں جو صرف مفتی صاحب اور دارالعلوم ہی کا نہیں بلکہ پوری ملت کا سرمایہ ثابت ہوئیں۔

مجموعۂ قوانین اسلام (مسلم پرسنل لاء) کا مسودہ تیار کیا

(۶)آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی تاسیس ہوئی،امیر شریعت رابع حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ مفتی صاحب کی قلمی وفقہی صلاحیت اور ان کے طریقۂ کار سے بے حد متأثر تھے،حضرت امیرؒ نے بارہا مفتی صاحب کی تحسین کرتے ہوئے ارشاد فرمایا"

مفتی صاحب ! آپ کے کام اور وقت میں بڑی برکت ہے "یہ بات مفتی صاحب نے مجھ سے کئی بار نقل فرمائی، حضرت امیرؒ مسلم پرسنل لاء بورڈ کے بانی ہی نہیں بلکہ تاحیات اس کے روح رواں بھی رہے ، کسی کام میں ان کی رائے کی مرکزی اہمیت ہوتی تھی، انہوں نے مسلم پرسنل لا سے متعلق مسائل کا ایک قانونی مجموعہ عصری اسلوب پر مرتب کرانے کا فیصلہ کیا جس کو عدالتوں میں حوالہ کے طور پر پیش کیا جاسکے، تمام اراکین بورڈ نے اس کی تائید کی، اس قانونی مجموعہ کا مسودہ تیار کرنے کی ذمہ داری جس شگفتہ نگار فقیہ، عصری حسیت کے نباض اور قانونی نزاکتوں کے رمز شناش عالم دین کے حصے میں آئی وہ مفتی صاحب کی شخصیت تھی، مفتی صاحب نے حضرت مہتمم دارالعلوم دیوبند (جو آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے اولین صدر عالی قدر بھی تھے) سے طویل رخصت منظور کرائی اور مہینوں مونگیر میں قیام فرماکر حضرت امیر کی نگرانی میں مسودہ کا کام مکمل کیا، اس طرح غیر اسلامی ہندوستان میں مسلمانوں کا پہلا قانونی دستاویزی مجموعہ (بزبان اردو)مفتی صاحب کے نوک قلم سے وجود میں آیا، جو علماء وفقہاء اور قانونی ماہرین کی کمیٹیوں کی نظر ثانی اور نظر نہائی کے بعد شائع ہوا۔

دارورسن سے پنجہ آزمائی

(۷) ہمارے وقت کے دارالافتاء میں مفتی صاحب واحد ایسے فقیہ تھے جنہوں نے کتاب وقلم کی بادیہ پیمائی کے ساتھ دارورسن سے بھی پنجہ آزمائی کی تھی، مئو سے دربھنگہ تک پیدل سفر کیا، جنگ آزادی کی تحریک میں بنفس نفیس شریک ہوئے ، انقلابی تقریروں سے لوگوں کے دل گرمائے، قید وبند کی صعوبتیں اٹھائیں، لیکن جب اس کا صلہ

ملنے کا وقت آیا تو گوشہ نشینی میں عافیت محسوس کی ،ہندوستان کے نقلی مجاہدین آزادی سرکاری وظائف و سہولیات پر عیش کرتے رہے اور حقیقی مجاہدین گوشۂ گمنامی میں نان شبینہ کے بھی محتاج رہے۔

مختلف رنگوں کا بے نظیر امتزاج

مفتی صاحب کو شروع سے جن اکابر اصحاب علم و تحقیق اور اعیان زہد و تقویٰ کی مصاحبت حاصل ہوئی اور مختلف فکر و نظر کے عباقرۂ روز گار سے ان کو استفادہ کے مواقع حاصل ہوئے اس نے ان کو بحر بیکراں میں تبدیل کر دیا تھا،۔۔۔۔۔۔۔انہوں نے دیوبند کا نصاب بھی پڑھا تھا اور ندوہ کے طرز تعلیم سے بھی استفادہ کیا تھا،۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مکتب سلیمانی کے بھی آداب سیکھے اور درسگاہ حبیب سے بھی فیض پایا تھا،۔۔۔۔۔۔۔۔ تصوف و احسان میں انوار مدنیؒ سے بھی روشنی پائی اور گلشن طیب کے شجرۂ طوبیٰ بھی ثابت ہوئے ، ۔۔۔۔۔سلسلۂ چشتیہ کا مذاق بھی پایا اور نقشبندیت کا رنگ بھی خوب زیب دیا،اس طرح مفتی صاحب کی شخصیت علم و فن اور روح و معنیٰ کے مختلف سمندروں کا مجموعہ اور فضل و کمال کا مجمع البحار تھی، فرحمہ اللہ۔

اللہ پاک ان کے ساتھ کرم کا معاملہ فرمائے،ان کی خدمات کو قبول فرمائے،اور آنے والی نسلوں کے لئے ان کو صدقۂ جاریہ بنائے آمین۔

جان کر منجملۂ خاصان میخانہ تجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ایک یادگار دستاویزی مضمون

(اس موقعہ پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنے ایک یادگار مضمون کو بھی ہم رشتۂ کتاب کردوں،جو حضرت مفتی صاحبؒ کی حیات مبارکہ میں لکھا گیاتھا،اورایک یادگاراور تاریخی مجلس میں خود مفتی صاحب کے سامنے اس کو پڑھا گیا،مفتی صاحب نے اس کو اپنی پسندیدگی کی سند عطا فرمائی اور اس پر اپنے دستخط ثبت فرمائے۔

اس کا پس منظر یہ ہے کہ جون ۲۰۰۲ء میں مسلم پرسنل لاء بورڈ کا انتخابی اجلاس دارالعلوم حیدرآباد میں منعقد ہوا،اس وقت میں دارالعلوم سبیل السلام میں مدرس تھا،اسی موقعہ پر اجلاس کے اختتام پر دارالعلوم سبیل السلام میں مفتی صاحب کے تلمیذ ارشد،حیدرآباد کی علمی ودینی نشأۃ ثانیہ کے معمار اور دارالعلوم سبیل السلام کے بانی وناظم ذی وقار حضرت مولانا محمد رضوان القاسمیؒ نے مفتی صاحب کے لئے "جلسۂ اعتراف خدمات" طے کیا،اس میں اکابر کے زبانی اظہار خیال کے علاوہ دو حضرات کے لئے تحریری مقالہ کی تجویز پاس ہوئی،ان میں مفتی صاحب کے عزیزو قریب اور معتمد خاص جناب ڈاکٹر سعودعالم قاسمی صاحب مدظلہٗ سابق ڈین شعبۂ دینیات مسلم یونیورسیٹی علی گڑھ کے علاوہ دوسرا نام حقیر راقم الحروف کاتھا،اسی تجویز کے تحت یہ مقالہ لکھا گیا تھا،اور جلسہ میں پڑھا

گیا،ایوارڈ مفتی صاحب کے ایک اور نامور تلمیذ،معروف علمی وروحانی گھرانے کے چشم وچراغ امیر شریعت سابع حضرت مولاناسید محمد ولی رحمانی صاحب کے ہاتھوں پیش کیا گیا.....وہ ایک یادگار اورتاریخی مجلس تھی،کیونکہ اس مجلس کے علاوہ کبھی کوئی مجلس مفتی صاحب کی حیات میں آپ کے اعتراف خدمات کے لئے منعقد نہیں ہوئی، .....مفتی صاحب کی خواہش تھی کہ یہ مضمون ان کی زندگی میں کتابچہ کی صورت میں شائع ہوجائے،میرا بھی ارادہ تھا لیکن آج کل پرٹلتا رہا،کسے خبر تھی کہ زندگی کا تھکاماندہ مسافر اتنی جلدہم سے رخصت ہوجائے گا،ان کے انتقال پرملال کے بعد میرا حوصلہ بھی جواب دے گیا،زندگی کی ساری رونقیں ماند پڑگئیں ،سارا نظام حیات تعطل کا شکار ہوگیا،وہ کیا گئے کہ زندگی ساری اداس ہوگئی،.....آج ایک عرصہ کے بعد وہ قرض ادا ہورہا ہے،یہ مفتی صاحب کی شخصیت پر ان کی زندگی میں لکھا گیا غالباً واحد مضمون ہے جس کو خود مفتی صاحب نے ملاحظہ فرماکر دستخط فرمائے تھے،اس طرح اس مضمون کی ایک دستاویزی اہمیت ہے،اسی لئے اس کو جوں کا توں شائع کیا جارہا ہے تاکہ اس کی یادگاری حیثیت برقرار رہے .....ڈاکٹر سعود عالم صاحب کا مضمون شاید محفوظ نہ رہ سکا،جیساکہ ان کی گفتگو سے اندازہ ہوا)

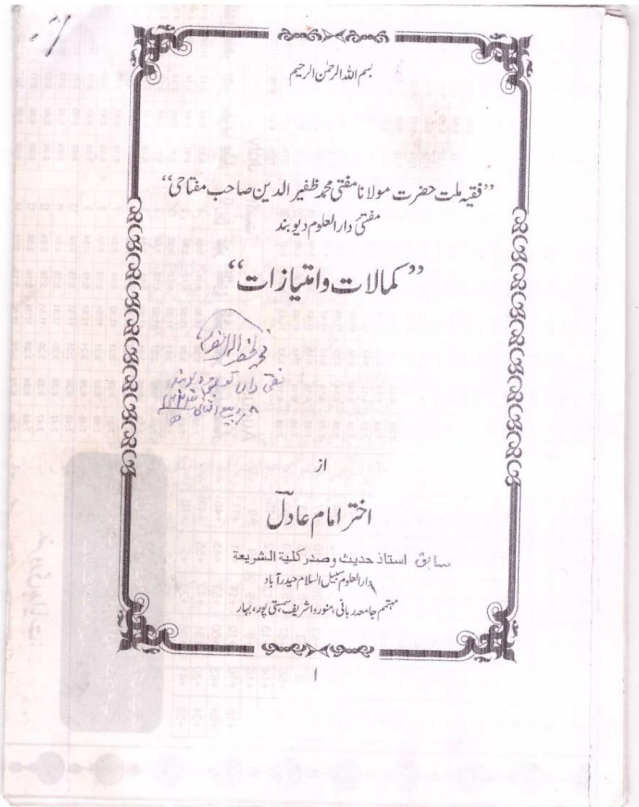

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"فقیہ ملت حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحب مفتاحی"

مفتیٔ دار العلوم دیوبند

"کمالات وامتیازات"

از

اختر امام عادل

سابق استاذ حدیث وصدر کلیۃ الشریعۃ

دار العلوم سبیل السلام حیدرآباد

مہتمم جامعہ ربانی، منورواشریف، سمستی پور، بہار

١

عکس ٹائیٹل کتابچہ "فقیہ ملت حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحیؒ

فقیہ ملت حضرت مولانا مفتی محمد ظفیرالدین مفتاحیؒ

کمالات وامتیازات

(تعمیر شخصیت کے شاندار نمونے)

ہر دور میں بعض ایسی شخصیتیں ہوئی ہیں جن کے ظاہری سراپا کو دیکھ کر ان کے علمی قدرو قیمت کا اندازہ نہیں لگا یا جا سکتا،ان کا علم ان کی تحریروں سے مترشح ہوتا ہے،ان کے علمی کارنامے ان کی عظمت اور جلالت شان کی دلیل ہوتے ہیں،جن کی ظاہری زندگی بہت خاموش مگر باطنی طور پر وہ سارے زمانے سے ہم کلام،جو اسباب کی دنیا میں مسکین اور بے وسیلہ،مگر علم وفن کے حقیقی ہتھیا روں سے لیس،جوبظاہری ساری دنیا سے کنارہ کش اور لاتعلق،مگر وقت آنے پر متحرک زندگی کیلئے وہی سب سے پیش پیش،جن کا اندازاپنے شاگردوں اور اہل تعلق کے ساتھ دوستانہ اور متواضعانہ،مگر اہل معرفت کیلئے وہ عظمت واحترام کے پہاڑ،جن کی زبان وقلم بالکل سادہ وعام فہم،مگر درحقیقت وہ سہل ممتنع اور معانی سے لبریز،مصنوعی تکلفات سے بالاتر،جو ہر تکلف سے تکلیف محسوس کریں،جن کیلئے ہر دل میں جگہ،جن کی خاطرہر دیدۂ ترمحو استقبال،جو ہر شخص کی تکلیف کو اپنی تکلیف محسوس کریں، جوہر غم کو اپنا غم اور ہر درد کو اپنا درد سمجھیں،یعنی ہمارے اس تکلفات کی دنیا کیلئے بالکل اچھوتی شخصیت،ایسے لوگ ہر دور میں پیدا ہوئے مگر بہت کم،جوبوریہ نشین تھے مگر

لوگوں کے دل ان کی طرف جھکتے تھے،جن کو دیکھ کر فقیری میں شاہی کا تصور ابھر تا تھا،ایسے لوگ تاریخ میں بہت کم ہوئے اور آج بھی بہت کم ہیں۔

میرے استاذمکرم فقیہ ملت،استاذالاساتذہ،رئیس القلم حضرت مولانا مفتی محمد ظفیرالدین صاحب مفتاحیؒ(دامت برکاتہم)مفتی دارالعلوم دیوبند انہی کمیاب شخصیتوں میں ایک ہیں۔

ولادت اور تعلیم وتربیت

حضرت مفتی صاحب کی ولادت ۷/مارچ ۱۹۲۶ءبہار کے مردم خیز ضلع دربھنگہ کے پورہ نوڈیہاگاؤں میں ہوئی،والد ماجد جناب شمس الدین صاحب علاقہ کے معزز شخص تھے،مفتی صاحب کی شخصیت پر ان کی صالح تربیت کے گہرے اثرات مرتب ہوئے،ابتدائی تعلیم وطن میں حاصل کی،اس کے بعد مدرسہ محمودیہ راجپورنیپال تشریف لے گئے اور اپنی ابتدائی تعلیم کی تکمیل فرمائی،فارسی اور متوسطات کی تعلیم مدرسہ وارث العلوم چھپرہ میں (از۱۹۳۴ءتا۱۹۴۰ء)اپنے مربی کبیر اورعم زاد حضرت مولانا عبدالرحمن صاحبؒ امیر شریعت خامس بہارواڑیسہ کے زیر تربیت رہ کر حاصل کی،اعلیٰ تعلیم کے لئے جامعہ مفتاح العلوم جامع شاہی مئوناتھ بھنجن تشریف لے گئے اور وہاں شوال المکرم ۱۳۵۹ھسے شعبان ۱۳۳۶ھتک محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمیؒ، مجاہد جلیل حضرت مولانا عبد اللطیف نعمانیؒ اور دیگر اکابر کی سرپرستی اور نگرانی میں مدارج ترقی طے کئے۔

خوب سے خوب تر کی جستجو

فراغت کے بعد عام طور پر طلبہ تلاش معاش کی سرگرمیوں میں گم ہو جاتے ہیں اور علم سے ان کا تعلق رسمی طور پر باقی رہ جاتا ہے،مفتی صاحب فراغت کے بعد بھی تلاش معاش میں نہیں بلکہ طلب علم کیلئے سرگرداں رہے،مفتی صاحب نے علم کی کسی منزل پر قناعت اختیار نہیں کی،بلکہ خوب سے خوب تر کی جستجومیں رہے،ان کی اسی جستجو،اور ذوق وشوق نے ان کواوج کمال تک پہونچایا،حضرت مفتی صاحب کی اسی جستجو کی کہانی خود ان کی زبانی ملاخطہ فرمائیں۔اپنی کتاب "علمی مراسلے"میں حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے تذکرے کے ذیل میں رقم طرازہیں:

"سالانہ امتحان دیکر گھر نہیں گیا،مئو میں رک گیا،حضرت الاستاذ مولانا حبیب الرحمن اعظمی مدظلہ کی خدمت میں آتا جاتا رہا،ایک دن دل کی بات زبان پر آئی،میں نے عرض کیا کہ حضرت!مجھے آپ دارالمصنفین اعظم گڑھ میں رکھوادیں،تاکہ لکھنے کے ذوق کی تکمیل ہوجائے۔مولانا نے فرمایا سعی کرونگا،اعظم گڑھ جاناہوااور سید صاحب سے ملاقات ہوئی تو تذکرہ ضرور کرونگا،اس جواب سے مجھے بہت خوشی ہوئی،میری خوش قسمتی سے ایک ہفتہ بعدہی حضرت الاستاذ اعظم گڑھ تشریف لے گئے،کوئی اپناعلمی کام تھا،میری خوش بختی دیکھئے کہ اس سفر میں سید صاحب سے جب آپ کی ملاقات ہوئی تو

از خود حضرت سید صاحب نے حضرت الاستاذ سے فرمایا کہ آپ اپنا کوئی اچھا شاگرد دے دیں، جس کو فقہ کیلئے اور لکھنے پڑھنے کا عمدہ ذوق بھی رکھتا ہو، اس موقع پر حضرت الاستاذ کو میری بات یاد آئی، سید صاحب نے فرمایا: ایک طالب علم ایسا ہے اور وہ اسی سال فارغ ہوا ہے اور ماشاء اللہ اس کی مجموعی صلاحیت قابل اطمینان ہے، میں جاکر اسے آپ کی خدمت میں بھیج دونگا، آپ خود اندازہ لگا لیں گے، حضرت الاستاذ مدظلہ جب واپس آئے اور خدمت میں میری حاضری ہوئی تو یہ سارا واقعہ سنایا اور فرمایا تم میرا خط لے کر چلے جاؤ اور سید صاحب سے ملاقات کر آؤ، میں نے عرض کیا بہت اچھا، دوایک دن بعد خط لکھواکر اعظم گڑھ حاضر ہوا۔

وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ سید صاحب جونپور اپنی بچی کے یہاں گئے ہوئے ہیں، تیسرے دن تشریف لائیں گے تیسرے دن کوئی دس بجے حضرت سید صاحب تشریف لے آئے، گھر سے ہوکر جب دفتر میں آکر بیٹھ گئے تو مولانا نگرامی نے فرمایا اب جاکر ملیں، دفتر میں حاضر ہوکر میں نے سلام عرض کیا، سامنے کرسی کی طرف اشارہ کرکے فرمایا بیٹھ جائیں، یہ میری سب سے پہلی ملاقات تھی، چند منٹ بعد فرمایا کہاں سے آنا ہوا؟ عرض کیا مئو سے حاضر ہوا، فرمانے لگے اچھا مولانا اعظمی نے آپ کو بھیجا ہے؟ عرض کیا، جی ہاں، اور مولانا کا خط نکال کر سامنے رکھ دیا، فرمایا آپ نے دورۂ حدیث پڑھ لیا؟ میں نے

جواب دیا جی ہاں،اسی سال ختم ہواہے،فرمایا پھر اب کیا چاہئے؟ماشاء اللہ آپ عالم دین بن گئے،پھر خود ہی فرمانے لگے دیکھ رہے ہیں کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں،اپنے تجربہ کی روشنی میں یقین دلاتا ہوں کہ اس علم سے دنیا نہیں ملتی،رہی دین کی بات تو وہ عمل سے متعلق ہے اور عمل کیلئے جتنا آپ پڑھ چکے ہیں بہت کافی ہے،عمل کر کے آخرت سنواریئے۔پھر آپ چاہتے کیا ہیں؟کہ اس کیلئے زحمت اٹھا کر یہاں آئے ہیں،میں نے جواب میں عرض کیا،سچی بات یہ ہے کہ آپ کی خدمت میں نہ دنیا طلب کرنے کی غرض سے حاضر ہوا ہوں اور نہ آخرت سنوارنے کی جستجو میں،میری یہ کھری کھری باتیں سن کر حضرت سید صاحب میری طرف حیرت سے دیکھنے لگے ،پھر فرمایا آپ کا مقصد کیا ہے؟عرض کیا حضرت!میں نے بچپن سے اب تک پندرہ سال مدرسہ میں گذار دیئے ہیں،تھوڑا بہت جو ہوسکا پڑھا بھی مگر صحیح یہ ہے کہ رسوخ فی العلم جسے کہتے ہیں یاعلمی شد ھ بدھ اور بصیرت،وہ حاصل نہیں ہوسکی ہے،دل کی تڑپ یہ ہے کہ کچھ آئے اور کسی درجے میں علمی مناسبت پیدا ہوجائے،میرے اس جواب کے بعد حضرت بالکل خاموش ہوگئے،فرمایا آپ کا کہاں قیام ہے؟عرض کیا مولانا نگرامی صاحب کا مہمان ہوں،ہنس کر فرمایاجایئے

کھاکر آرام کیجئے،اب ظہر بعد ملاقات ہوگی۔[9]

اس روداد سے مفتی صاحب کا نقطۂ نظر سامنے آتاہے اور علم کے بعد علم اور رسوخ فی العلم کی کیسی طلب اور جستجو ان کے اندر تھی،اس کا اندازہ ہوتا ہے۔

بزرگوں سے تعلق

انہوں نے اپنے بزرگوں سے علمی استفادہ کا سلسلہ جاری رکھا،اور ہمیشہ اپنے کوطالب علم سمجھا،حضرت مفتی صاحب نے اپنے نام بزرگوں کے جو مراسلات جمع فرمائے ہیں،ان کو پڑھنے سے اندازہ ہوتاہے کہ مفتی صاحب کو فراغت کے بعدعہد تدریس میں بھی ہمیشہ اپنے بزرگوں سے گہرا علمی تعلق رہا،اور مختلف علمی مسائل ومراحل میں وہ ان سے مشورہ لیتے رہے،ہرمشکل وقت میں مفتی صاحب نے اپنے بزرگوں سے رجوع فرمایا اور ان بزرگوں نے بھی کبھی مفتی صاحب کی حوصلہ افزائی میں کمی نہیں کی،آگے بڑھ کر سینے سے لگا یااور ہر ممکن طور پر ان کی مدد فرمائی،مفتی صاحب علامتی طور پر مکتوبات سلیمانی کے بارے میں اپنا حال تحریر فرماتے ہیں:

" اپنا حال یہ رہاکہ جب کبھی فراغت زمانہ نے بے رخی دیکھائی یا دل پرزخم لگے تو مکتوبات سلیمانی نے ڈھارس بندھائی اور صبر و شکیبائی کی ایک آ ہنی دیوار کھڑی کردی، جس کو بڑسے بڑا طوفان

---

[9]علمی مراسلے ص:۹تا۱۲

بھی متاثر نہیں کرسکا،اور جس کے سہارے زندگی کی ٹرین فراٹے بھرتے چلتی رہی،،ان مکتوبات میں والدین کی سی محبت،اساتذہ کی سی شفقت اور مرشد ومربی کی تربیت،اور رشد وہدایت سب کی سب جمع ہیں،پڑھنے والے آنکھیں کھول کر پڑھیں گے تو انہیں اپنے سوالات کے جوابات ملیں گے،دیدۂ بصیرت میں روشنی آئے گی اور قلوب رحمت خداوندی سے معمور ہوتے نظر آئیں گے۔[10]

اکابر سے استفادہ

حضرت مفتی صاحب واقعی بڑے خوش نصیب ہیں،ان کو اکابرین امت کا سایہ ملا،اور انہوں نے ان سے بھر پور فائدہ اٹھایا،ان اکابر نے علمی اور نجی ہر مسئلے میں مفتی صاحب کی رہنمائی فرمائی،مثلاًحضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ اپنے ایک مکتوب میں جوعلمی مراسلے میں آٹھویں نمبر پر ہے،مفتی صاحب کو تحریر فرماتے ہیں:

”آپ کے محبت نامے سے خوشی ہوئی،آپ نے اپنے خط میں شروع ہی میں دوجگہ ”شومئ قسمت“اور”بدنصیبی“کے لفظ لکھے ہیں،قسمت اور عطاکے نصیب اللہ کے فعل ہیں،اور اللہ کے افعال کی طرف برائی کی نسبت نہیں کی جا سکتی،افسوس ہوتا ہے کہ عموماًبلویٰ کے سبب سے علماء کادامن بھی لفظی سوءاعتقاد سے عدم تنبہ کے سبب پاک نہیں

---

[10]علمی مراسلے ص:۱۶

ہوتا،احتراز فرمایئے،اس کی جگہ محرومی لکھئے،بحمدللہ قرآن کاترجمہ پڑھنا شروع کیا،اور اس کا فائدہ بھی محسوس فرمایا،زادکم اللہ تعالیٰ بہٖ نفعاً،آپ کوجو کھٹک آخرت سے متعلق ہوتی ہے یہی وہ سچ ہے جو انشاء اللہ صحیح آبیاری سے نشو نما پائے گا،آپ بعض اوقات مقررہ میں "الم یعلم بان اللہ یری"کا مراقبہ کریں۔

آپ کسی طبیب کی طرف بھی توجہ فرمائیں،معدہ کی خرابی کا اثر تو نہیں جو ایسا خواب دیکھتے ہیں ایک دعا بھی لکھتا ہوں،اعوذ باللہ من الشیطان وشر ھذہ الرویا،۳بار،پھر بائیں طرف منہ کرکے پہلو بدل لیں"۔[11]

ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

"آپ صبر وشکر سے دنیا کی تکلیفوں کو برداشت کریں،کوئی کسی کو دھوکہ نہیں دیتا وہ دھوکہ خود اپنے ہی کو دیتا ہے،ولا یحیق المکر السیئی الا باھلہ، اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ آپ کی نصرت فرمائیں اورآپ کو اپنی مرضیات کی اتباع کی توفیق بخشیں"[12]

ایک اور مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

"حزن وملال کا نتیجہ ترک اعمال توکسی طرح درست نہیں۔

---

[11] ۔ص:۱۲

[12] ۔ ص:۳۷،مکتوب:۳۷

نوامرا تلخ ترمی زن چوذوق نغمہ کم یابی۔

دنیا میں غم احوال کا نہیں اعمال کا چاہئے،جس غم سے اعمال میں فرق آجائے وہ تو محرومی کاسبب ہے یہ غم دین کا غم نہیں ہو سکتا ،اور زیادہ بیداری اور زیادہ عبادت اور زیادہ دعا اور زیادہ اضطراب اور زیادہ اضطرار چاہئے کہ یہ حالات دور ہوں،اور یہ مصائب دفع ہوں"۔[13]

حضرت مفتی صاحب نے اپنے جن بزرگوں کا بہت گہرا اثر قبول کیا ہے ان میں حضرت علامہ گیلانی ؒبھی ہیں،علامہ گیلانی ؒنے مختلف مواقع پر مفتی صاحب کو اپنے علمی مشوروں اور رہنمائیوں سے نوازا ہے،۴/ اپریل ۱۹۵۰ءکے ایک طویل مکتوب میں مفتی صاحب کو تحریر فرماتے ہیں:

"آپ ابھی زندگی کے ابتدائی ایام میں ہیں،سب سے بڑا دشوار مسئلہ تصنیف وتالیف کے کاروبار میں کتابوں کا ہے،جن کا موجودہ حالات میں وسیع پیمانے پر مہیا ہونا آسان نہیں ہے،تاہم کچھ کتابوں سے چارہ نہیں،درسی کتابیں تو کم از کم آپ کے مدرسہ میں یا آس پاس کے مولویوں کے پاس مل جائیں گی،اسی امر کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک مشورہ تو ایسی کتابوں سے تعلق رکھتا ہے جن کیلئے کتابوں کی چنداں ضرورت نہ ہوگی،صرف فکروغور کی صلاحیت ہے اوروہ یہ

---

[13] ۔ ص:۳۸،مکتوب:۳۸

ہیں جن کی اس زمانہ میں سخت ضرورت ہے،(پھر حضرت مولانا گیلانی ؒ نے چار عنوانات اور ان سے متعلق ضروری تفصیلات تحریر کی ہیں،اور مفتی صاحب کو مشورہ دیا ہے کہ آپ ان پر کام کریں ا۔مصائب النبی وآل النبی،۲۔انسانیت بیمار ہے،۳۔الو فود و المکاتیب ۴،بعض مشاہیر صحابہ[14]

مکتوب:۳ میں فرماتے ہیں:

"آپ کے مکتوبات کو دیکھ کر ضرورت محسوس ہوئی کہ چندچیزوں کے متعلق آپ کی خدمت میں عرض کردوں،تاریخ المساجد کے سلسلہ میں یہ عرض کرناہے کہ کہیں ایسانہ ہوکہ اس کے پیچھے پڑ کر آپ دوسری چیزوں کو چھوڑ بیٹھیں مطلب یہ ہے کہ آپ کی تحریروں اورانشائی صلاحیت کو دیکھ کرمیں یہ توقع کرتا ہوں کہ جیسے جیسے مشق وتجربہ آپ کا بڑھتا جائیگا آپ انشاء اللہ ایک پختہ کار مصنف بن کر اسلام کی خدمت کریں گے،بس مناسب یہ ہے کہ تاریخ المساجد کے ساتھ ساتھ اور بھی جن عنوانوں پر لکھنے لکھانے کا خیال وارادہ ہواس کو بھی مسلسل جاری رکھئے،اور تاریخ المساجدکے متعلق مطالعہ جاری رکھئے،یہ آسان کام نہیں ہے کہ چند کتابوں کے پڑھ لینے کے بعد آپ کوکافی مواد مل جائیگا جلدی سے کام نہ کیجئے،

---

[14] - ص:۷۹تا۸۱،مکتوب:۴

برس دوبرس یا جتنی مدت بھی لگ جائے اس کا خیال نہ کیجئے یادداشت کی ایک کتاب بنالیجئے، اور مطالعہ جاری رکھئے اس موضوع کے متعلق جو ملتا چلاجائے یاد داشت میں نوٹ کرتے چلے جایئے اور جب آپ کو محسوس ہو کہ مواد کافی جمع ہوچکا ہے تب ترتیب کا کام انجام دیجئے، اس کے لئے سینکڑوں کتابیں آپ کو پڑھنی پڑیں گی، خرید خرید کر کہاں تک پڑھتے رہیں گے ادھر ادھر سے عاریۃً جو کتاب بھی مل جائے، عربی، فارسی، اردو سب کو پڑھتے رہئے اور اسی کے ساتھ دوسرے عنوانوں پر بھی جو کچھ لکھنا چاہتے ہوں لکھتے رہئے۔[15]

حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی ؒ بانی ندوۃ المصنفین، دہلی اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

"اسلام کا نظام عفت وعصمت" بہت خوب ہے، جی جما کر لکھئے، قدیم کتابوں کے علاوہ جدید کتابوں سے بھی مدد لینی چاہئے۔[16]

ایک اور مکتوب میں لکھتے ہیں:

"تاریخ ملت کے حصوں پر آپ کا مضمون پڑھ کر مولانا عبدالماجد صاحب نے بھی وہ حصص طلب فرمائے ہیں "جامع اموی دمشق" جلد ارسال فرمایئے، کوئی اور بھی دلچسپ اور معیاری مضمون لکھئے،

---

[15] ۔ ص:۸۷

[16] ۔ ص:۱۲۷، مکتوب:۲۱

حلقۂ برہان میں بحمداللہ اب آپ کافی نیک نام ہیں،مضامین کم لکھئے ،مگر جو کچھ لکھئے،معیار کے مطابق لکھئے،معیار کی بقا بڑی بات ہے"[17]

بزرگوں کاماضی دیکھنا چاہئے

یہی وہ چیزیں ہیں جنہوں نے مفتی صاحب کی شخصیت کی تعمیر میں بنیادی رول ادا کیا اور مفتی صاحب مفتاح العلوم مئو،نگرام لکھنؤاور سانحہ مونگیر کے مختلف ادوارسے گذرتے ہوئے دارالعلوم دیوبند پہنچے،اور آج دارالافتاء دارالعلوم دیوبند کے سب سے بزرگ،کہنہ مشق اور تجربہ کار مفتی ہیں (خیال رہے کہ یہ مضمون حضرت کی حیات میں لکھا گیا تھا)آج کے دور کی سب سے بڑی کمزوی یہ ہے کہ لوگ اپنے بزرگوں سے رابطہ نہیں رکھتے،نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے استفادہ کا سلسلہ رک جاتا ہے،اور وہ بڑے آدمی نہیں بن پاتے،حضرت مفتی صاحب کی زندگی ایسے تمام لوگوں کیلئے مرقع عبرت ہے،میں نے مفتی صاحب کے ما ضی اور ابتدائی عہد کا ذکر اسی لئے چھیڑا ہے کہ بزرگوں کی زندگی کا ماضی جس قدر عبرت انگیزاور سبق آموز ہوتا ہے،ان کا حال نہیں ہوتا،ان کے ماضی میں ایک عام انسان کیلئے رہنمائیوں کاسامان ہوتاہے،اور وہ ایک متعلم اور صاحب طلب کیلئے نسخۂ ارتقاء فراہم کرتاہے۔

حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری علیہ الرحمہ فرمایا کرتے تھے کہ:

---

[17] ۔ ص:۱۲۶،مکتوب:۲۰

"جو ہمارا ماضی دیکھے وہ کامیاب جو ہمارا حال دیکھے وہ ناکام"۔[18]

مفتی صاحب کے دور کی کوئی ایسی قابل ذکر شخصیت نہیں ملتی جن سے آپ کے علمی مراسم نہ ہوں، کچھ مفتی صاحب کی اپنی صلاحیت، اخذ کرنے والی طبیعت اور فطرت کی سلامتی کا دخل ہے اور کچھ ان بزرگوں سے روابط کا فیض کہ اللہ نے ان سے بڑے بڑے کام لئے اور اکابر اور اعیان امت نے ان پر بھر پور اعتماد کا اظہار فرمایا، بڑے اہم اہم کام ان کے سپرد کئے اور مفتی صاحب ایسے تمام آزمائشی مرحلوں سے پوری کامیابی کے ساتھ گذرے۔

مفتی صاحب پر اکابر کا اعتماد

اعتماد کا اصل اظہار اہم ذمہ داریوں کی تفویض سے ہوتا ہے، لیکن بعض مرتبہ زبان و قلم سے بھی ایسے جملے نکل جاتے ہیں جن سے اعتماد اور عظمت واحترام کا اظہار ہوتا ہے، "علمی مراسلے" میں ایسے بعض مکاتیب ہیں جن کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مفتی صاحب پر اکابر کو کس قدر اعتماد تھا اور ان کی قدر و قیمت بزرگوں کے دلوں میں کیسی تھی؟ بعض نمونے ملاحظہ فرمایئے:

حضرت مفتی صاحب کی پہلی شاہکار تصنیف "اسلام کا نظام مساجد"

(جو پہلی بار ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہوئی اور دوبارہ دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد سے شائع ہوئی) سید العلماء حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ نے ملاحظہ فرمایا تو اپنے تأثرات کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا:

---

[18] - آپ بیتی، حضرت شیخ زکریاؒ

"اپنی محدود معلومات کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ مساجد کے متعلق اتنی جامعیت کے ساتھ تمام پہلوؤں پر اتنی حاوی کتاب نہ صرف اردو بلکہ فارسی اور عربی میں بھی میری نظر سے نہیں گذری،وقت کی ایک بڑی ضرورت کی تکمیل میں مولانا موصوف نے اپنا وقت صرف فرمایا ہے اگرچہ تالیف وتصنیف کے میدان کے تازہ واردوں میں ہیں،لیکن خالص نیت ان کی محنت کے بار آور کرنے میں ممدو معاون ثابت ہوئی،بظاہر موضوع کے متعلق مشکل ہی سے کوئی قابل ذکر مسئلہ غالباًایسا باقی رہاہے جس کا تذکرہ کسی نہ کسی حیثیت سے اس کتاب میں نہ آگیا ہو،ماشاء اللہ عبارت والفاظ،ترتیب سب میں سنجیدگی، متانت اور صفائی وروشنی پائی جاتی ہے،اختلافی مسائل میں مولوی صاحب نے رفق وملائمت کا پہلو اختیار کرکے علماء کے طبقہ متصلبہ ومتقشفہ کیلئے ایک اچھا نمونہ پیش کیاہے[19]

"تاریخ مساجد"کا موضوع مفتی صاحب کو مولانا گیلانی ہی نے دیاتھا، ابھی کتاب تیار بھی نہیں ہوئی تھی مگر اعتماد کی بنیاد پر حضرت مولانا گیلانی ؒ نے مفتی صاحب کواپنےایک مکتوب میں تحریرفرمایا:

"نظام المساجد کے مقدمہ کی ضرورت کب پیش آئے گی،میرا توجی چاہتاتھا کہ تاریخ المساجد پر بھی مقدمہ آپ مجھ سے لکھواتے،اس

---

[19] - حاشیہ ص:۷۳

وقت آپ کا یہ نیازمندزندہ رہاتو تعمیل ارشاد کو اپنی سعادت خیال کرے گا"[20]

ایک اور مکتوب میں لکھتے ہیں:

"واقعہ تو یہ ہے کہ اس میدان کے آپ تازہ وارد نو جوانوں میں ہیں، آپ کی صلاحیتوں کو دیکھ کر دل اس پیشین گوئی کی جرأت کرتاہے کہ مستقبل میں آپ کا قلم انشاء اللہ اسلام کی کوئی نمایاں خدمت انجام دے گا"[21]

ایک موقع پر مفتی صاحب نےاستفادہ کیلئےرمضان میں گیلانی قیام کرنے کی خواہش ظاہر کی تو حضرت مولانا گیلانیؒ نے تحریر فرمایا:

"آپ نے رمضان میں گیلانی کی رونق افروزی کے ارادے کا اظہار فرماکر بڑی نوازش فرمائی ہے،لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس مسئلے میں میرے مقصوددر حقیقت یحیٰ میاں سلمہ تھے ورنہ استغفر اللہ آپ جیسے عالم کوقطعاً اس کی ضرورت نہیں،زیادہ سے زیادہ آپ میری لکھی ہوئی تفسیری جزوں کا مطالعہ کر سکتے ہیں ورنہ پڑھنے کی قطعاً ضرورت نہیں،ماشاء اللہ آپ ایک مستعد عالم ہیں"۔[22]

---

[20] ۔علمی مراسلے،ص:۷۶،مکتوب:۱

[21] ۔ ص:۸۷،مکتوب:۹

[22] ۔ ص:۹۶،مکتوب:۱۶

ایک خط کا آغاز ان الفاظ سے فرمایا:

"رفیع القدر، سلیم القدر، الصوفی الصافی الکاتب مولانا ظفیر الترھتی المتھلائی ایدکم اللہ بروح منہ"۔[23]

ایک خط میں اس طرح مخاطب فرمایا:

"سیدی! ومتصف بالصلاح والعافیۃ"۔[24]

☆امیر شریعت رابع حضرت مولاناسید منت اللہ صاحب رحمانیؒ مفتی صاحب کے خصوصی قدرداں تھے،حضرت امیر شریعت نے مفتی صاحب سے کئی اہم کام لئے،کئی تحریرات ان کی شائع کیں،کئی اہم موضوعات پر مقالے لکھوائے،حضرت مفتی صاحب،حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ کی دعوت پر دارالعلوم دیوبند تشریف لے جا چکے تھے،مگر حضرت امیر شریعت ان کو امارت شرعیہ کا نظام سنبھالنے کیلئے امارت لانا چاہتے تھے،کئی خطوط حضرت امیر شریعت نے اس مضمون کے لکھے،مگر حضرت حکیم الاسلام نے مفتی صاحب کو اجازت نہیں دی،یعنی حضرت حکیم الاسلام،مفتی صاحب کو دارالعلوم دیوبند کی ضرورت سمجھتے تھے،اور حضرت امیر شریعت امارت شرعیہ کی ضرورت ،حضرت امیر شریعت کے ایک مکتوب گرامی کا اقتباس ملاخطہ ہو:

"ایسا لگتاہے کہ ہم لوگوں کے درمیان شاید کوئی غلط فہمی ہوگئی ہے،

---

[23] ۔ص:۹۹،مکتوب:۲۵

[24] ۔ ص:۱۰۵۔مکتوب:۲۵

مجھ سے آپ سے تو یہ بات طے ہوچکی تھی کہ آپ کو دفتر امارت شرعیہ میں تشریف لانا ہے اور مستقلاً آنا ہے، مگر یہ پھلواری شریف جیسی جگہ ہے، شاید آپ کا دل نہ لگ سکے، اسی لئے میں نے عرض کیا تھا کہ چھ ماہ کی چھٹی لے لیں، اگر دل لگ جائے تو بے حد خوشی کی بات ہے، اسی وقت یہ گفتگو آپ سے ہوئی تھی کہ آپ نقیب اور افتاء کا کام سنبھالیں گے، بعد کو میں نے یہ بھی لکھا تھا کہ محکمۂ قضاء خالی ہے۔

بہر حال اس وقت میں چاہتا ہوں کہ آپ تشریف لاکر افتاء اور اخبار نقیب کا کام کریں، میں نے پچھلی بار امارت کی مالی حالت کے پیش نظر ماہ۔/۱۵۰ کی پیشکش کی تھی، شاید یہ بات پیش نظر ہو، اس لئے اب عرض ہے کہ اس وقت جو یافت آپ کی دارالعلوم میں ہے وہ پیش کی جائے گی"[25]

حضرت مفتی صاحب کی کتاب تاریخ مساجد پر اپنی تعارفی تحریر میں حضرت امیر شریعتؒ تحریر فرماتے ہیں:

"عزیز محترم مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحب مفتاحی علمی اور دینی حلقہ میں بہت جانی پہچانی شخصیت کے مالک ہیں، وہ لانبے عرصے سے علمی و تحقیقی و تصنیفی خدمات انجام دے رہے ہیں، انکی بہت سی

---

[25] ۔ ص:۲۳۴، مکتوب:۱۳

کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں،اور ذوق وشوق کے ساتھ پڑھی گئی ہیں اور کاموں کے علاوہ صرف فتاویٰ دارالعلوم کی تحقیق،استخراج اور ترتیب ہی اتنا بڑااوراہم کارنامہ ہے،جو ان کے علمی و تحقیقی وقار واعتبار کوممتاز کرتا ہے،خدائے تعالیٰ نے ان کے وقت میں برکت اور خدمات کو قبولیت سے نوازا ہے،صرف فتاویٰ دارالعلوم ہی نہیں، نظام مساجد،نظام عفت وعصمت،نظام امن،سیرت و سوانح اور متعدد موضوعات پران کی کتابیں آئیں اور ہاتھوں ہاتھ لی گئیں"۔[26]

حضرت مفتی صاحب دارالعلوم دیوبند کس اعزازواحترام کے ساتھ بلائے گئے اس کا اندازہ حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب کے اس اولین مکتوب سے ہوتا ہے جس میں مفتی صاحب کو دارالعلوم آنے کی دعوت دی گئی ہے،اس خط سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت مہتمم صاحب کی نگاہ میں مفتی صاحب کا کیا مقام تھا؟خط کا ایک اقتباس ملاخطہ ہو:

"اس وقت ایک خاص ضرورت سے عریضہ لکھ رہاہوں اوروہ یہ کہ اس وقت دارالعلوم کے شعبۂ تبلیغ اور یہاں کی نشرواشاعت کو ایک ایسے فاضل کی ضرورت ہے جو صاحب قلم،خوش تحریر اور شرعی مسائل وحقائق کو دلنشیں پیرایہ میں اچھے اسلوب کے ساتھ موجودہ

---

[26] - تاریخ مساجد،ص:۱۲

دور کے تقاضوں کے مطابق پیش کرنے پر قادر ہو، بالخصوص مودودی صاحب اور جماعت اسلامی کے ان نظریات کا جو اہلسنت والجماعت کے مسلک سے ملے ہوئے ہیں، اصول ودلائل کی روشنی میں تجزیہ کرکے اس کا کھرا اور کھوٹا واضح کرسکتا ہو، مخالف تحریرات سے انصاف واعتدال کے ساتھ اخذ کرنے اوراس پر سنجیدہ گرفت کرنے کا سلیقہ رکھتا ہو، اور معاندین کے شبہات واعتراضات کا شرعی مواد کی روشنی میں متانت کے ساتھ جواب دینے کی اہلیت رکھتا ہو، ساتھ ہی اکابر دارالعلوم کے بتائے ہوئے اسالیب بیان وعنوانات کلام پر ان کے ذوق وفکر کی روح کو محفوظ رکھتے ہوئے اچھے ڈھنگ سے ان کے مقصود کی ترجمانی کرسکتا ہو، اور اسی کے ساتھ احیاناً دارالعلوم کی ضروریات یا بیرونی دعوت پر حسب موقع تقریر وبیان پر بھی قادر ہو، اس سلسلہ میں مختلف شخصیتوں کے نام کے ساتھ جناب کا اسم گرامی بھی سامنے آیا، بندہ کا حسن ظن تو ذات سامی کی نسبت جو ہے وہ ہے اور وہی اس تحریر کا باعث ہوا ہے، لیکن درخواست یہ ہے کہ معیار بالا کی روسے اپنے بارے میں خودجناب بے تکلف اظہار خیال فرمادیں کہ ان خدمات مطلوبہ کو جذبات مذکورہ کے ساتھ انجام دے سکیں گے یانہیں؟"[27]

---

[27] ۔ ص:۶۳، مکتوب:۲

مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ جتنی قدر مفتی صاحب کی ان کے بڑوں نے کی، چھوٹوں سے اتنی قدر نہ ہوسکی، یہ ہماری معرفت کی کمی ہے، مفتی صاحب کی عظمت میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

مفتی صاحب نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ جس طرح دین اور علم دین کی خدمت کیلئے صرف کیا، اور تلامذہ کے علاوہ کتابوں کا بڑا علمی سرمایہ جمع فرمایا، وہ ان کی جلالت شان کیلئے کافی ہے۔

مفتی صاحب ایک خاموش طبع انسان ہیں، ان کے یہاں شورو پکار اور اعلان و تشہیر کے ہنگامے نہیں ہیں، وہ خاموشی اور یکسوئی کے ساتھ کام کرنے کے قائل ہیں، اور انہوں نے اسی خاموشی کے ساتھ ایسے بڑے بڑے کام کئے جو بڑی بڑی ہنگامہ خیز شخصیتیں نہیں کرسکیں، میں تفصیل میں نہیں جاؤں گا، آنے والا مؤرخ اور مبصر جب اس کا تجزیہ کرے گا تو تفصیلات سامنے آئینگی ،لیکن میں بعض اشارات کرنا ضروری سمجھتا ہوں:

مفتی صاحب کے اہم علمی کارنامے

"نظام مساجد" کے بارے میں آپ نے مولانا گیلانی کی زبانی سن ہی لیا کہ:

"مساجد کے متعلق اتنی جامعیت کے ساتھ تمام پہلوؤں پر اتنی حاوی کتاب نہ صرف اردو بلکہ فارسی اور عربی میں بھی میری نظر سے نہیں گذری"[28]

---

[28] - ص:۳۷، علمی مراسلے

"فتاویٰ درالعلوم دیوبند"کی تدوین وترتیب کاکام،کام نہیں عظیم الشان کارنامہ ہے،اورحضرت امیر شریعت نے درست فرمایاہے:

"اورکاموں کے علاوہ صرف فتاویٰ دارالعلوم کی تحقیق،استخراج اور ترتیب ہی اتنابڑا اور اہم کارنامہ ہے،جو ان کے علمی وتحقیقی وقار واعتبارکو ممتاز کرتاہے"۔[29]

☆جو کام دارالعلوم میں برسوں سے نہیں ہوسکاتھا،مفتی صاحب نے اس اہم ترین کام کوبڑی تیزی کے ساتھ انجام دیا اور فتاویٰ دارالعلوم کی بارہ جلدیں چند سالوں میں سامنے آگئیں،پھر انقلاب کے بعد بعض ایسے ناخوشگوار حالات پیش آئے کہ مفتی صاحب دل شکستہ ہوگئے اور باقاعدہ ان کو یہ کام بھی نہیں دیاگیا،چنانچہ مفتی صاحب کے اس کام سے الگ ہوجانے کے بعدآج تک کوئی جلد سامنے نہ آسکی،(اس تحریر کے بعد بعض جلدیں شائع ہوئیں)مفتی صاحب نے تن تنہا وہ کام کیا جو پوری کمیٹی انجام دیتی ہے،اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحب کو صحت وعافیت سے رکھے اور ان کا سایۂ عافیت ہم پرتادیر قائم رکھے۔آمین

☆کتب خانۂ دارالعلوم دیوبند میں مفتی صاحب نے بحیثیت مدیر کتب خانہ جو انقلابی اور تعمیری خدمات انجام دیں وہ دارالعلوم کی تاریخ میں کبھی فراموش نہیں کی جا سکیں گی کتب خانہ میں جدید ترین کیٹلاگ کانظام،کتابوں

---

[29] - تاریخ مساجد،ص:۱۲

سے استفادہ کی صورتیں،دارالمطالعہ کا نظام وغیرہ کئی غیر معمولی اصلاحات مفتی صاحب نے فرمائیں،مفتی صاحب کتب خانہ سے پھر دارالافتاء چلے آئے،لیکن جس مرحلہ پر وہ کتب خانہ کو چھوڑ آئے تھے اتنے سال گذرنے کے باوجود کتب خانہ آج تک اسی مرحلہ پر رکا ہوا ہے،(اس تحریر کے بعد بعض بڑی پیش رفتیں ہوئی ہیں)

یہ ہے مفتی صاحب کا امتیاز،بظاہر بہت سادہ اور ہلکے پھلکے،لیکن ایسے صاحب تاثیر کہ جس کام پر ہاتھ ڈالا،تکمیل تک پہنچاکر دم لیا،اور جس کام سے ہاتھ کھینچ لیا یا ان کو روک دیا گیا وہ کام بھی وہیں پر رک گیا،ایسے لوگ تاریخ میں بہت کم ہوتے ہیں اور ایسی ہی شخصیات عبقری کہلاتی ہیں،اللہ تعالیٰ مفتی صاحب کو اپنی شان کے مطابق بدلہ عنایت فرمائیں،آمین۔

☆مجموعۂ قوانین اسلامی (مسلم پرسنل لاء بورڈ)کا اصل مسودہ مفتی صاحب ہی نے تیار کیا،بعد میں کمیٹیوں نے اس پر غورو خوض کیا اور ترمیمات کیں،لیکن اصل چیز تو مسودہ ہے،کسی ذمہ دار ادارہ کی طرف سے قانونی مسودہ تیار کرنا آسان کام نہیں ہے،ہندوستان میں بہت سی علمی شخصیات موجود تھیں اور ہیں،لیکن ان میں حضرت مفتی صاحب کا انتخاب بلاوجہ نہیں تھا،قانون اور تعبیرات کی دنیا میں یہ ان کی امتیازی شان کی دلیل ہے،مسودہ تیار ہونے کے بعد دس ہزار ترمیمات بھی کردی جائیں تب بھی وہ اسی مسودہ اور فکر کے تابع مانی جائیں گی،بات سے بات نکالنا آسان ہے،لیکن پہلی بات پیدا کرنا آسان نہیں ہے،اور یہی وہ مشکل کام تھاجس کو حضرت مفتی صاحب نے انجام دیا۔

فجزاہ اللہ عنا احسن الجزا۔

☆مفتی صاحب نے کتب خانۂ دارالعلوم دیوبند کے مخطوطات کا جو تعارف لکھاہے،وہ بھی اپنی جگہ بے انتہا اہم کام ہے،مخطوطات اور قلمی کتابوں سے مناسبت ہر عالم کو نہیں ہوتی،چند عبقری لوگ ہوتے ہیں،حضرت مفتی صاحب نے دو جلدوں میں مخطوطات کا تعارف لکھ کر ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے اور دارالعلوم کی طرف سے ایک بڑی ذمہ داری پوری فرمائی ہے۔

ایک شفیق مربی

ایک محسن استاذ اور شفیق مربی کی حیثیت سے بھی مفتی صاحب کا مقام بہت ممتاز ہے،مفتی صاحب جس اپنائیت اور خلوص کے ساتھ طلبہ پر محنت کرتے ہیں اور ان کو بلند سے بلند مقام تک پہنچنے کی ترغیب دیتے ہیں وہ لاجواب ہے،مفتی صاحب کے فتویٰ کی زبان ہو یاکسی مقالہ کی،انتہائی سادہ اور عام فہم ہوتی ہے،عام قاری سمجھتا ہے کہ ایسی عبارت کوئی بھی لکھ سکتا ہے ، لیکن لکھنے کو بیٹھے تو اچھے اچھے قلم کار ویسی عبارت لکھنے میں دقت محسوس کریں،مفتی صاحب چھوٹے اور عام فہم جملے لکھتے ہیں،طول طویل جملوں،اور مشکل الفاظ سے فتویٰ یا مضمون کو گرانبار نہیں کرتے،اس طرح ان کا فتوی یا مضمون علمی بھی ہوتا ہے اور زبان وادب کے لحاظ سے معیاری بھی،ہندوستان میں ایسے مفتی گنتی کے ہونگے جو اپنے فتاویٰ میں ان دونوں اوصاف کی رعایت رکھ پاتے ہوں۔

حضرت مفتی صاحب اپنے تلامذہ اور مستفیدین میں بھی اپنا رنگ منتقل کرنا چاہتے ہیں،وہ زبان سے کچھ نہیں بولتے لیکن غیر محسوس طور پر ان کے تلامذہ ان سے متاثر ہوتے ہیں اور ان کا رنگ قبول کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ خواہشمند،اور باذوق طلبہ کی علمی اور فکری تربیت سے بھی دریغ نہیں کرتے،حالانکہ مفتی صاحب اب عمر کی جس منزل میں ہیں وہ ان کے آرام کرنے کی ہے،لیکن آج بھی وہ جوانوں سے زیادہ محنت کرتے ہیں،اور طلباء وفضلاء کی تعمیر وتربیت کاکام انجام دیتے ہیں، مگر آج کا مسئلہ تو یہ ہے کہ:

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے رہرو منزل ہی نہیں

جب میں دارالافتاء دارالعلوم دیوبند میں زیر تعلیم تھا تو میری مشق فتاویٰ حضرت مفتی صاحب سے متعلق تھی،مفتی صاحب نہ صرف مشق فتاویٰ پر توجہ دیتے تھی بلکہ بعض دیگر موضوعات پر تحقیق بھی کراتے تھے،پورے ملک سے لوگ علمی طور پر ان سےرجوع ہوتے تھے،انہیں میں سے بعض کام وہ اپنے تلامذہ کے بھی حوالہ کردیتے تھے،میں ان کا ادنیٰ ترین شاگرد تھا،لیکن مجھ پر ان کی عنایات بہت زیادہ تھیں،کئی اہم علمی موضوعات پر مفتی صاحب نے مجھ سے کام لیا اور مجھے کتابوں سے قریب کیا .....علم وتحقیق،یافقہی مقالات لکھنے کاجو کچھ بھی ذوق میرے اندر پیدا ہوااس ذوق کا تخم اولین حضرت مفتی صاحب نے ہی ڈالا،بحث ونظر اور اسلامک فقہ اکیڈمی کو میں نے انہی کےذریعہ جا نا ، علمی کتابوں کے مطالعہ کا شوق آپ ہی کی نظر عنایت کا صدقہ ہے،اللہ تعالیٰ

حضرت مفتی صاحب کو جزائے خیر سے نوازے،آمین۔میرا رواں رواں آپ کے احسانات سے شرسار ہے۔

☆مفتی صاحب کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ وہ ہونہار طلبہ کی بڑی حوصلہ افزائی فرماتے ہیں،اور اپنے بیٹے کی طرح ان سے محبت فرماتے ہیں،میں توکچھ نہیں ہوں،لیکن میرے خاندانی پس منظر کی بنا پر مفتی صاحب مجھ سے بڑی محبت وشفقت فرماتےہیں،جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے،اللہ تعالیٰ مجھے اس محبت کے فیضان سے زندگی کی آخری سانس تک نواز تا رہے۔آمین

صاحب دل فقیہ

ان تمام علمی کمالات وامتیازات کے ساتھ مفتی صاحب،صاحب دل بھی ہیں،وہ تصوف وروحانیت سے بھی بڑا حصہ رکھتے ہیں،وہ فقیہ خشک نہیں،بلکہ صاحب دل،اور صاحب نظر فقیہ ہیں،وہ حالات زمانہ پر بھی نگاہ رکھتے ہیں،اور احوال قلب،اور کیفیات درون پر بھی۔

حضرت مفتی صاحب شروع میں حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ سے بیعت ہونا چاہتے تھے اس لئے کہ ان کی بعض باطنی اصلاحات پہلے سے جاری تھیں،اور علامہ کے بعض وظائف بھی مفتی صاحب پڑھتے تھے،پھر مئو میں تعلیم حاصل کرنے کی بناپر مقامی اور ذہنی قرب بھی ان سے تھا،اگر چیکہ ایک خیال حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے بھی بیعت کا آتا تھا،

چنانچہ حضرت مفتی صاحب نے اپنے تمام معاملات کی طرح آخر اس معاملہ میں بھی حضرت علامہؒ سے مشورہ کیا،علامہ ندویؒ نے جواب میں تحریر فرمایا:

"حضرت مولانا مدنی دامت فیو ضہم کی ذات کے مقابلہ میں میرا نام لینا صرف آپ کی چشم محبت کا کرشمہ ہے ورنہ میں تو ان کے جوتہ کا تسمہ کھولنے کے لائق بھی نہیں۔

ع چہ نسبت خاک رابا عالم پاک

بزرگوں کامشورہ یہی ہے کہ "خاک ازتودۂ کلاں بردار" میرے پاس حضرت والاتھانوی رحمتہ اللہ تعالیٰ کی نسبت کے سوا کچھ بھی نہیں ،اس لئے میرے باب میں آپ کو غلط فہمی نہ ہو"[30]

چنانچہ حضرت علامہؒ کے حکم کے مطابق حضرت مفتی صاحب،حضرت مدنی ؒکی طرف رجوع ہوئے،مگر اس کیلئے علامہ سے سفارشی خط لکھنے کی درخواست کی،حضرت علامہ ندویؒ نے درخواست قبول کرتے ہوئے جواب تحریر فرمایا:

"مولانا مدنی کی خدمت میں آپ کاخط مع اپنے خط کے بھیج دیا اور آپ کے نام کا لفافہ بھی پتہ لکھ کر اس میں رکھ دیا ہے،امید ہے کہ وہ آپ کوجواب دیں گے آپ کے اس کارڈسے آپ کے اضطراب کا حال معلوم ہواجس بات سے آپ ڈرتے ہیں اس کے مآل عواقب

---

[30] ۔ علمی مراسلے،ص:۲۸،مکتوب:۱۸

دنیاوی اوراخروی کوپوری طرح ذہن نشیں کرکے اور اس کو بقوت دفع کیجئے اوریہ دعاپڑھئے، اللھم اجعلنی اخشاک کانی اراک ابداًحتی القاک واسعدنی بتقواک ولاتشقنی بمعصیتک۔ اپنے کو ہر وقت علم یاعمل میں مشغول رکھئے،تاکہ بیہودہ افکاردل و دماغ میں جگہ نہ پائیں،دلی دعا ہے کہ آپ کواللہ تعالیٰ اپنے حفظ و امان میں رکھیں والسلام۔"[31]

حضرت مفتی صاحب بالآخرحضرت شیخ الاسلام مدنیؒ سے بیعت ہو گئے، "علمی مراسلے" میں خود تحریر فرماتے ہیں:

حضرت سید صاحب کے حکم سے ۱۰/ مئی ۱۹۷۴ءکو بعد نماز مغرب ڈاکٹرعبد العلی صاحب کے مکان واقع لکھنؤمیں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے باضابطہ بیعت ہوگیاتھا"۔[32]

پھر علامہ ندویؒ نے باطنی تعلیمات کا سلسلہ بند کردیا اور مشورہ دیاکہ اب وہ تعلیمات کے باب میں حضرت مدنیؒ ہی سے رجوع کریں،اپنے ایک خط میں تحریر فرمایا:

"اب آپ تعلیمات کے باب میں حضرت مولانا مدنیؒ ہی سے معلوم کریں اور ان پر عمل کریں "[33]

---

[31] ۔ علمی مراسلے:ص،۳۰،مکتوب:۲۱

[32] ۔ حاشیہ میں،ص:۳۳

[33] ۔ ص:۳۳،مکتوب:۲۹

اس طرح ایک خاصی مدت تک حضرت مدنی ؒکی روحانی تربیت سے آپ نے استفادہ فرمایا،اور سلوک کے منازل طے کئے،حضرت مدنیؒ کے وصال کے بعد آپ حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ سے رجوع ہوئے اور سلوک کی تکمیل فرمائی،بالآخر حضرت قاری صاحبؒ کے مجاز ہوئے،اس کا پس منظر خود حضرت مفتی صاحب کی زبانی سنئے:

"حضرت مولانا فضل اللہ صاحب صدر شعبۂ دینیات عثمانیہ یونیورسیٹی علی گڑھ،حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کے پوتے تھےاوران کو اولاًدادارحمتہ اللہ علیہ سے اجازت بیعت تھی،حضرت مولانانے بے وہم وگمان ۴/صفر۱۳۹۵ھ مسجد دارالعلوم دیوبند میں بعد نماز ظہر روک لیا اور مولانا محمد رضوان امام مسجد عامرہ،حیدرآباد کو بلایا جو حضرت کے ساتھ آئے ہوئے تھےاور فرمایا میرے کپڑوں میں شیخ سنوسیؒ والا جبہ لے آؤ،جب وہ آگیا تو انہوں نے میرے حوالہ یہ کہتے ہوئے فرمایا کہ میں تم کومسلمانوں کوبیعت کرنے کی اجازت دیتا ہوں اوریہ جبہ عطا کرتا ہوں،میرے نزدیک اس کے مستحق تم ہی ہو"۔[34]

یہ پورا واقعہ حضرت مفتی صاحب نے اپنے پیر ومرشدحضرت حکیم الاسلامؒ کو لکھ بھیجا جو اس وقت بمبئی کے سفر پر تھے،حضرت حکیم الاسلامؒ نے

---

[34] ۔علمی مراسلے،حاشیہ:۲۔ص:۷۰

جواب میں جوخط تحریر فرمایا ہے اس میں مفتی صاحب کو اجازت بیعت عنایت فرمائی، حضرت حکیم الاسلامؒ کے اس تاریخی خط کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"سلام مسنون، نیاز مقرون، گرامی نامہ صادر ہوا، خوشی ہوئی، حضرت مولانا فضل اللہ صاحب دام مجدہ اپنے طریقے کے ایک شیخ اور بے نفس بزرگ ہیں، ان کی توجہ اور اجازت دہی بلا شبہ فضل خداوندی ہے، اس پیش کش کو آپ نے قبول فرمایا، انشاء اللہ یہ خیر وبرکت کا باعث ہوگی، آپ کے عمل اور مجاہدہ سے بڑھ کر یہ شہادت اور پیش کش بلاشبہ وقیع ہے، اور فضل خداوندی ہے، اس بنا پر میں بھی آپ کو اجازت دیتا ہوں، جو بھی اللہ کا نام پوچھے بتلا دیا کریں، یہ آپ کیلئے اوراس کیلئے نافع ہوگا، حق تعالیٰ ہم سب کو تقویٰ وطہارت عطا فرمائیں" [35]

غرض مفتی صاحب ایک صاحب نظر اور صاحب دل فقیہ ہیں، زندگی میں بڑے انقلابات سے دوچار ہوئے اور مشکل سے مشکل حالات کا سامنا کیا، مگر علم کا یہ مسافر پوری استقامت کے ساتھ اپنی راہ پر گامزن ہے، اور دوست دشمن سب کو پیغام محبت دیتا ہوا اپنی حقیقی منزل کی طرف بڑھ رہاہے، اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحب کو صحت وعافیت سے نوازے، شرور وفتن سے محفوظ رکھے، فیضان عام سے عام تر کرے اور ہم چھوٹوں کو آپ سے بھر پور استفادہ

---

[35] ۔ ص:۷۰ مکتوب:۱۲

کی توفیق بخشے، آمین[36]۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

(۱۹/ جون ۲۰۰۲ء)

[36]۔واضح رہے کہ یہ مضمون حضرت مفتی صاحب کی زندگی میں لکھا گیا تھا، جیسا کہ اوپر تاریخ نگارش سے ظاہر ہوتا ہے، حضرت مفتی صاحب اس مضمون کے لکھنے کے بعد کئی سال تک باحیات رہے، ان کی خواہش تھی کہ یہ مضمون کتابچہ کی صورت میں شائع ہو جائے، چنانچہ اس کی کتابت بھی کرالی گئی تھی، لیکن افسوس حضرت الاستاذ کی حیات میں یہ کتابچہ شائع نہ ہو سکا۔ حضرت مفتی صاحبؒ کا وصال ۳۱ /مارچ ۲۰۱۱ء مطابق ۲۵ /ربیع الاول ۱۴۳۲ھ کو اپنے وطن پورہ ضلع دربھنگہ میں ہوا۔